سہ ماہی

ادبی نشیمن

جون تا اگست ۲۰۱۸ء

قیمت: ۲۰/روپے

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

उर्दू त्रैमासिक

अदबी नशेमन

लखनऊ – 226 003

वर्ष : 01 अंक 03

जून–जुलाई–अगस्त 2018

RNI No. UPURD / 2017 / 74845

मूल्य : 20 रु./–

वार्षिक मूल्य : 70 रु./–

اتر پردیش کے گورنر عزت مآب رام نائیک انور جلالپوری پر مرکوز ادبی نشیمن کے خصوصی شمارے کا اجراء کرتے ہوئے
ساتھ میں ہیں ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد (بائیں) اور ادبی مشیر رفعت عزمی (دائیں) و دیگر معززین

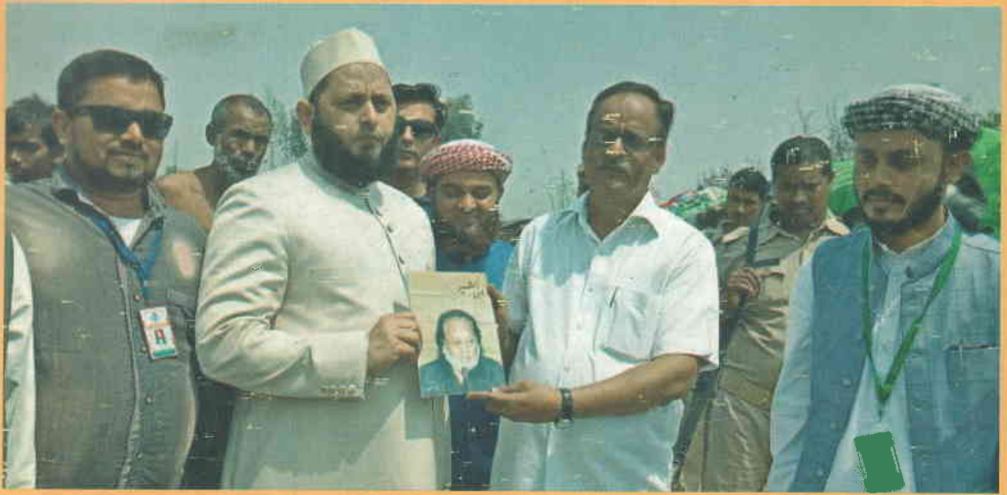

امام عیدگاہ، مولانا خالد رشید فرنگی محلی کو 'ادبی نشیمن' کا خصوصی شمارہ 'انور جلالپوری' پیش کرتے ہوئے ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد

प्रकाशक व मुद्रक, अहमद रशीक द्वारा, नोमानी प्रिन्टिंग प्रेस बारूदखाना, गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं 544 सी / 168 अलमास बाग,हरदोई रोड़ लखनऊ से प्रकाशित सम्पादक, डॉ0 सलीम अहमद

جون تا اگست ۲۰۱۸ء

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ADBEE NASHEMAN

Email
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ : ۲۰/روپے

سالانہ : ۷۵/روپے

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544، الماس باغ
ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Address
Editor Urdu Quaterly
Adbee Nasheman
168/C-544,
Almasbagh, Hardoi Road,
Lucknow-03

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob.: 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر
رفعت عزمی
Mob.: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- پروفیسر انور ظہیر انصاری (بڑودہ)
- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
- ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)

پبلشر اور پرنٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

دستاویز

امراؤ جان ادا کی قبر

مرزا ہادی رسوؔا کے معرکہ آرا ناول ''امراؤ جان'' کی اشاعت کے بعد یہ سوال قارئین کے ذہن میں قائم رہا کہ ان کے ناول کا کردار امراؤ جان واقعی کوئی جیتی جاگتی ایک بدنصیب عورت تھی یا محض افسانوی طور پر موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔

معتبر محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ امراؤ جان صرف افسانوی کردار نہیں تھا بلکہ لکھنؤ کی ایک رقاصہ تھی۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس کی قبر یہاں ہونے کا کوئی جواز اس لئے نہیں بنتا کہ وہ زیارت کے لئے کربلا گئی تھی اور راستے ہی میں کہیں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

لکھنوی تہذیب وادب سے براہ راست متعلق آل انیس علی احمد دانش کا کہنا ہے کہ اس کی قبر لکھنؤ میں ہے لیکن اس سلسلہ میں وہ کوئی تصویر یا دیگر ثبوت فراہم نہیں کر سکے۔

اردو اکادمی دہلی کے ادبی جریدے ''ایوان اردو دہلی'' میں کئی دہائیوں پہلے امراؤ جان کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی۔ تصویر کے سلسلہ میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ مرزا ہادی رسوؔا کے انتقال کے بعد ان کے بکس میں ایک لفافے کے اندر یہ تصویر برآمد ہوئی تھی، جس کی پشت پر امراؤ جان لکھا تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں اپنی تعیناتی کے دوران جدید شاعر رفعت عزمؔی کو بنارس کے لوگوں نے بتایا کہ درگاہ فاطمین میں ایک قبر موجود ہے جس پر امراؤ بیگم لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے خود جا کر اس خستہ حال قبر کو دیکھا تھا۔ یہ تقریباً 30-29 سال قبل کی بات ہے۔

گزشتہ سال یہ خبر میڈیا میں گشت کرنے لگی کہ وارانسی میں امراؤ جان کی قبر کی تزئین کاری کی جا رہی ہے۔ موجودہ شکل میں اس قبر کی دو تصویریں ادب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے پیش خدمت ہیں۔

(ادارہ)

فہرست عناوین

اداریہ		۳
پاکستان کے ہم عصر اردو رسائل	ڈاکٹر عبدالحیٔ	۴
زندگانی تھی تری مہتاب	قطب اللہ	۷
تذکرہ نویسی کے خدوخال	ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری	۹
ماہنامہ کتاب کا الوداعی	ڈاکٹر شکیل احمد	۱۲
کئی چاند تھے سر آسماں	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۷
اردو غزل میں تصور عشق	ڈاکٹر پی محمد داؤد محسن	۲۶
شہریار کی نظمیاتی شاعری	ڈاکٹر ساجد حسین	۳۵
بچے کی نفسیات اور ادب	صالحہ صدیقی	۴۱
سماجی رزمیہ ''لفظوں کا لہو''	ابراہیم افسر	۴۵
افسانے		
کرما	احمد رشید	۴۸
مشکوٰۃ	شمیم فاطمہ	۵۱
کہ جہاں مل گیا	ندیم راعی	۵۵
چریوتی چریوتی.......	ڈاکٹر بشری بانو	۵۹
غزلیں		
پروفیسر شہپر رسول		۱۶
عبدالواحد تنویر		۱۶
شفیق اعظمی		۵۸
سلیم انصاری		۵۸
محمد مجاہد سید (دوہا)		۵۴
تبصرے		
تنقیدی دریچے	مبصر: ابراہیم افسر	۶۱
علامہ ڈراما	مبصر: مہر فاطمہ	۶۳
براہان کے اہم کتابات	مبصر: ڈاکٹر شہزادانجم برہانی	۶۴

نظریہ

ادبی نشیمن کا گزشتہ شمارہ انور جلال پوری پر مرکوز تھا ادبی حلقوں اور قارئین میں بے حد مقبول ہوا اور ہر طرف سے پذیرائی حاصل ہوئی ادارہ اپنے تمام قارئین کا ممنون ہے۔ ملک کے مختلف شہروں سے اس خصوصی شمارہ کا مطالبہ ہونے لگا چونکہ محدود وسائل میں شمارہ کی اشاعت کو انجام دیا جا رہا ہے اس لئے قارئین کا ایک اچھا خاصا طبقہ اس شمارہ سے محروم رہ گیا۔ میں ایسے تمام قارئین سے معذرت خواہ اور آئندہ اس بات کو ملحوظ رکھا جائیگا کہ کوئی بھی قاری یا طالب، شمارہ سے عاری نہ رہ جائے۔

گزشتہ ایک برس سے اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی تشکیل نہ ہونے سے تمام کام زیر التوا تھے خاص طور سے اردو اکادمی کی جانب سے کتابوں پر دیئے جانے والے انعامات، کتابوں کی اشاعت وغیرہ۔ موجودہ حکومت نے اردو اکادمی، اتر پردیش کی چیرپرسن اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیرمین کی تقرری کر اردو والوں میں حکومت کے تئیں جو مایوسی تھی اسے دور کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اردو کے ان بڑے اداروں میں دونوں شخصیتوں کا تعلق فارسی ادب سے ہے۔ ساتھ ہی اردو اکادمی کی اکزیکیوٹو کی میٹنگ میں کتابوں پر انعامات کی سب سے کم رقم پانچ ہزار سے بڑھا کر دس ہزار روپئے اور وہ کتابیں جو انعامات سے محروم رہ گئی ہوں ان کے مصنف کو جمع کی گئی کتاب کی قیمت ادا کرنے کی تجویز منظور کی گئی جو قابل تحسین قدم ہے۔

اسی ضمن میں مدارس کے امور اور مدرسہ بورڈ میں شفافیت لانے کی غرض سے موجودہ حکومت کی جانب سے نئے پورٹل کا نظم بھی ایک قابل تعریف قدم ہے۔ اس پورٹل کے شروع ہو جانے سے جہاں ایک جانب تمام مدارس، ان کے اساتذہ اور طلباء کا اندراج آن لائن ہو گیا ہے وہیں کاغذ پر چلنے والے اور حکومت سے گرانٹ لینے والے فرضی مدارس پر نہ صرف قدغن لگا بلکہ ایسے فرضی گرانٹ شدہ مدارس کو گرانٹ فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گرانٹ شدہ ان مدرسوں کو یعنی وہ مدرسے جو حکومت سے امداد لے رہے ہیں انھیں آنے والے وقت میں حکومت سے جاری ہونے والے احکام پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ اس کے تحت مدرسوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا جو بندوبست ابھی مدرسہ جدید کاری کے تحت چل رہا ہے اس سے نصاب میں مزید اضافہ کی توقع ہے اس کے لئے مدرسوں کو تیار رہنا ہوگا۔ حکومت کا فرمان جاری ہوگا تو عمل درآمد کرنا مدرسوں کا اخلاقی فرض ہوگا یا مدرسوں کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی بانی صدر اور لکھنؤ کی مختلف تنظیموں نیز سماجی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ بیگم حامدہ حبیب اللہ کا گزشتہ ۱۸ر مارچ ۲۰۱۸ کو لکھنؤ میں ۱۰۱ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ملک کی پہلی اردو اکادمی اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ میں ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ ادارے کی چیئرمین شپ اردو کے معروف شاعر اور قانون داں پنڈت آنند نرائن ملا کو تفویض کی گئی اور بیگم حامدہ حبیب اللہ کا انتخاب اس کے صدر کے طور پر کیا گیا۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی نے اعلان کیا تھا کہ اردو کے تمام مسائل اب اردو اکادمی کے توسط سے حل کر دیئے جائیں گے۔

ادارہ اردو کی ایک فعال اور ہمدرد شخصیت کے انتقال سے غمزدہ ہے اور اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

پاکستان میں ہمعصر اردو رسائل

ایک مختصر جائزہ

عبدالحی
اسسٹنٹ ایڈیٹر (این.سی.پی.یو.ایل نئی دہلی ۔۲۵)
موبائل نمبر 9899572095

پاکستان میں اردو رسائل کی روشن روایت رہی ہے۔ یوں تو قیام پاکستان کے بعد سے ہی وہاں سے کئی اہم ادبی رسائل کی اشاعت ہورہی ہے۔ سویرا، افکار، ادب لطیف، سیپ، مکالمہ، فنون، ارتقا، جیسے رسائل نے ادبی صحافت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم عصر ادبی رسائل میں آج دنیا زاد، تسطیر، لو، چہار سو، ادب لطیف، آبشار، اجرا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں سبھی رسائل کا ذکر تو ممکن نہیں پھر بھی کچھ اہم رسائل کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ذینت حسام اور اجمل کمال نے کراچی سے ستمبر 1989 میں ’آج‘ کا آغاز کیا تھا۔ سہ ماہی ’آج‘ کی اشاعت سے قبل منتخب نظم ونثر کے کتابی سلسلے کے طور سے سات مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ذینت حسام نے پہلے شمارے کے اداریے میں بتایا تھا کہ اِس کے شمارے، سرما، بہار، گرما اور خزاں کے عنوان سے سال میں چار دفعہ چھپیں گے۔ اِس رسالے میں انتخاب کے عنوان سے کسی ایک شاعر یا ادیب کی تخلیقات پر مبنی خصوصی گوشہ شائع کیا جاتا ہے۔ اِس کے پہلے شمارے میں نیر مسعود کی تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔ پہلے شمارے میں تاراشنکر مکھرجی، ستیہ جیت رے، اسد محمد خاں، محمد خالد اختر، افضال احمد سید، نسرین انجم بھٹی وغیرہ کی تحریریں شامل ہیں۔ رسالے میں عالمی ادب سے انتخاب بھی تواتر سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اجمل کمال نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ انھوں نے ’آج‘ کے باضابطہ آغاز سے قبل 1981 میں اسے کتابی سلسلے کے طور سے شروع کیا تھا لیکن مالی حالات نے اِس رسالے کا تسلسل برقرار رکھنے کی اجازت نہیں دی اور رسالہ بند ہوگیا۔ بعد میں 1989 میں اِسے پھر شروع کیا گیا۔ آج میں غزلیں نہیں چھپتی ہیں اور شعری تخلیقات کے نام پر صرف نثری نظموں کو جگہ ملتی ہے۔ اجمل کمال فکشن پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے مارکیز، میلان کنڈرا اور نرمل ساہنی وغیرہ پر خصوصی شمارے نکالے۔ عربی و فارسی کہانیاں، کراچی کی کہانی، ہندی کہانی اور ناول بالوں کا گچھا، گینڈا پہلوان شائع خصوصی شمارے تاریخی ودستاویزی نوعیت کے حامل ہیں۔ کتابی سلسلہ ’دنیا زاد‘ ہر چار مہینے پر کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے اکتوبر 2008 میں اِس کا پہلا شمارہ شائع کیا تھا۔

’آج‘ میں ادبی تخلیقات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ تنقیدی مضامین بہت کم چھپتے ہیں۔ ساتھ ہی خطوط کا کالم بھی نہیں ہے۔ اِس میں سماجی موضوعات پر بھی معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں جو ’آج‘ کے دیگر رسالے سے منفرد قرار دیتے ہیں۔ گمنام تحیروں کی دوبارہ اشاعت بھی اِس رسالے کا اہم کارنامہ ہے۔ آج کی اشاعت کو 28 سال ہوگئے ہیں اور اب بھی یہ سالہ ادب نواز دوستوں میں مصروف ہے۔ اجمل کمال کا انتخاب آج کی شناخت ہے۔

دنیا زاد کے اداریے بڑے **علمی** اور فلسفیانہ ہوتے ہیں۔ شمارے میں عالمی ادب اور دیگر زبانوں کی معیاری تحریروں کی اشاعت

پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ آصف فرخی نے اکیسویں صدی کی رنگ بدلتی دنیا کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور ان رنگوں کی آمیزش سے تحریر کردہ تخلیقات کو دنیازاد میں جگہ دی ہے۔ آج کا شاعر وادیب جس کرب اور گھٹن میں زندگی گزار رہا ہے وہ سب دنیازاد کے صفحات پر بکھرے ملیں گے۔ دنیا زاد کے ہر شمارے کا ایک نام بھی ہوتا ہے۔ دنیازاد ادبی رسائل کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ قاسم یعقوب دنیازاد پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

دنیازاد ایک ایسی کھڑکی ہے جس نے اردو کی تنگ فکری فضا کو باہر کی وسیع تخلیقی اور تنقیدی دنیا سے جوڑ رکھا ہے۔ عموماً اس کام کو ترجموں کی شکل میں پورا کیا جاتا ہے مگر دنیازاد میں انگریزی اور دنیا کی دیگر دوسری زبانوں میں اعلیٰ ادب کے مسائل پر ڈھیر ساری بحث بھی ملتی ہے جس سے اردو لکھاریوں کی براہِ راست شمولیت سے اِس پرچے کے قد میں اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی طور پر دنیازاد کا مزاج فکشن کی طرف ہے۔ خالص تنقید اور شاعری دوسری ترجیح میں شمار لگتی ہیں۔ (قاسم یعقوب، ویب سائنس درشن، ستمبر 2017)

نئے ادب کے ترجمان کے طور پر فیصل آباد سے قاسم یعقوب نے ادبی رسالہ ’نقاط‘ کا آغاز کیا تھا۔ ابھی تک اس کے 15 شمارے شائع ہوچکے ہیں۔ قاسم یعقوب خود بھی شاعر، ناقد اور کالم نگار ہیں اور ادبی رسائل کی تاریخ اور تنقید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالے میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ رسالہ عام رسالوں سے ہٹ کر ہو اور قاری کو یکسانیت کا احساس نہ ہو۔ یہ 500 صفحات پر مشتمل ضخیم رسالہ ہے۔ یہ میں عالمی ادب، تراجم، شعری ونثری تخلیقات کے علاوہ خصوصی مطالعہ کے تحت کسی ایک شاعر یا ادیب کا تعارف اور اس کی تحریریں پیش کی جاتی ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں قاسم یعقوب نے موجودہ ادبی صحافت پر ہی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ادبی صحافت سے اردو حلقے کی بے اعتنائی پر شکوہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ آج ادبی رسالوں کا قاری وہ ہے جو ادبی دنیا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ عام سماجیات اور دوسرے میدان سے تعلق رکھتا ہے۔ قاسم یعقوب نے سوشل میڈیا کی وجہ سے ادبی صحافت کے فروغ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نقاط نئے عہد کے معیاری رسالوں میں شمار کیا جائے گا۔ نقاط میں آصف فرخی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، تحسین گیلانی، نسیم سید، من...... وغیرہ کی تحریریں تواتر سے شائع ہوتی ہیں۔ نقاط میں موجودہ ادب کے حوالے سے کئی اہم مسائل پر علمی بحثیں شائع ہوئیں۔ اس کا نظم نمبر اور عالمی ترجمہ نمبر بہت مقبول ہوا۔

معروف شاعر اور نقاد نصیر احمد ناصر نے 1997 میں سہ ماہی ’تسطیر‘ لاہور کا آغاز کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لیے جانا جاتا ہے۔ رسالے کا اداریہ اور پیش کش بہت شاندار ہوتا ہے۔ نصیر احمد ناصر خود بھی اچھے شاعر ہیں اور ان کی نثری نظمیں بہت پاپولر ہوتی ہیں۔ سمندر راز داں گر ہوتا جیسی شہرہ آفاق نظم کے خالق نے تسطیر جیسا ادبی رسالہ نکالا تو ہند و پاک کے سبھی ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالے کا استقبال کیا۔ تسطیر نے ادبی گروپ بندی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ تسطیر میں نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے بھی قلمکاروں کا تعاون اس رسالے کو حاصل رہا۔ ترنم ریاض، ذوقی، ذکیہ مشہدی، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ کی نگارشات تسطیر میں نظر آجاتی ہیں۔ ادب میں نئے اور تازہ رجحانات کو پروان چڑھانے میں تسطیر کامیاب رہا۔ 2012 میں یہ بند ہوگیا تھا لیکن کچھ مہینوں بعد اسے کتابی شکل میں دوبارہ شروع کیا گیا۔ رسالے میں اردو ادب کے سبھی اصناف کو شامل کیا جاتا ہے۔ انٹرویو میں ادیبوں اور شاعروں کے دلچسپ جوابات متاثر کرتے ہیں۔

راولپنڈی سے نکلنے والا ماہنامہ ’چہار سو‘ بھی ادبی رسائل کی دنیا میں منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اِس رسالے کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے۔ اگست 1997 میں اِس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا جو ممتاز مفتی پر مرکوز تھا۔ سید ضمیر جعفری احمد ہاشمی اور گلزار جاوید نے رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے

میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس رسالے میں ادا جعفری، احمد فراز، اشفاق احمد، اعتبار ساجد، اعجاز پروین، بلراج کومل، پروین شاکر، دیویندر اسر، رتن سنگھ، شمیم حنفی، منور رانا، سید ضمیر جعفری، شموئل احمد، مجتبیٰ حسین، محمود شام، محمود ہاشمی، مرزا حامد بیگ، ہند کشور وکرم، مشرف عالم ذوقی وغیرہ پر خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ حال ہی میں چہارسو کا گلزار دہلوی کی حیات و خدمات پر خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اردو ادب کی حقیقی خدمت کا ثبوت ہے۔ اس کے مدیر رسالے کو ترتیب دے کر اسے اردو قارئین کو مفت میں ارسال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے تمام شمارے آن لائن بھی دستیاب ہیں جنھیں کوئی بھی ڈاؤن لوڈ کرکے پڑھ سکتا ہے۔ 'چہارسو' نے کچھ گمنام شعرا اور ادبا پر بھی خصوصی گوشے شائع کیے اور ادبی دنیا سے انھیں روبرو کرایا ہے۔ چہارسو کی خدمات پر معروف ناول نگار مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

میں ایک ایسے ادبی پرچے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ پچیس برس سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے لیکن حیادار اتنا ہے کہ شرم وحیا کا مارا جان بوجھ کر گمنامی کے پردے میں روپوش رہتا ہے اور یہ گلزار جاوید کا چہارسو ہے جس کے بانی مدیر اعلیٰ سید ضمیر جعفری ہیں یعنی بعد از مرگ بھی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ گلزار جاوید جن سے آج تک ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا کوئی نہایت نستعلیق نوعیت کے گاڑھی اردو بولنے والے صاحب ہیں۔ کچھ سرپھرے سے بھی لگتے ہیں کہ پچپن برس تک ایک ادبی پرچہ باقاعدگی سے شائع کرتے جانا کسی صاحب عقل وخرد کا کام نہیں ہوتا۔ اس پرچے میں ہم ایسے ادیبوں اور شاعروں کو پڑھتے ہیں جن میں سے اکثر کے نام سے بھی کم از کم میری واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستان کے اردو ادیبوں کی بھی مناسب نمائندگی ہوتی ہے یعنی یہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اردو زبان کا ایک مستحکم پل ہے۔ (مستنصر حسین تارڑ، روزنامہ نئی بات 25 مئی 2016)

چہارسو آج بھی پوری شان کے ساتھ جاری ہے اور ادیبوں و شاعروں کی پذیرائی کر رہا ہے۔

احسن سلیم نے جنوری تا مارچ 2010 کے شمارے سے سہ ماہی 'اجرا' کا آغاز کیا تھا۔ احسن سلیم نے اس رسالے کو بہتر بنانے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اجرا موجودہ ادبی صورتِ حال، موجودہ مسائل اور ادب کی اہمیت پر کھل کر گفتگو کرتا ہے اور قارئین کے سامنے ادب کے موجودہ منظرنامہ پر بحث ومباحثے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے مدیر احسن سلیم کا گزشتہ برس انتقال ہوگیا تھا لیکن رسالہ اب بھی جاری ہے اور حال ہی میں اس کا 25واں شمارہ منظر عام پر آیا ہے۔ رسالے میں انٹرویو، مشرق و مغرب، فلک آثار، سخن سخن، داستان سرا، دل آویزیاں، وسعت بیان جیسے مستقل کالموں سے مزین اجرا آج بھی اردو حلقے میں مقبول ہے۔ اجرا میں سماجی ناہمواریوں اور ادبی منافقتوں پر لکھے اداریے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہاں محض چند رسائل کے تذکرے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی اچھے رسائل پاکستان سے شائع ہو رہے ہیں۔ مکالمہ (مبین مرزا)، ارتقا (محمد علی صدیقی، اسالیب (تنزیل عنبر)، سمبل (علی محمد فرشی)، ادبیات (محمد عالم بٹ)، کہانی کار (احمد اعجاز)، سویرا (محمد سلیم الرحمٰن)، کولاژ (شاہدہ تبسم)، تناظر (ایم خالد فیاض)، مباحث (تحسین فراقی) اور سلیم فواد کندی کا رسالہ 'آبشار' ادبی صحافت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور اردو ادبی صحافت پر طاری جمود کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ رسائل کی ترتیب وپیش کش سے زیادہ اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ آج اردو کا قاری کہاں ہے اور اسے کس طرح اردو رسالوں اور کتابوں سے جوڑا جائے۔ یہ بات درست نہیں کہ اردو کا قاری ختم ہو گیا ہے۔ اردو قاری ختم نہیں ہوا ہے بلکہ گم ہو گیا ہے۔ ہمیں اسی گمشدہ قاری کی تلاش کرنی ہوگی تب ہی اردو رسائل کا روشن دور واپس آئے گا۔

●●●

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

قطب اللہ
پترکار پورم، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل نمبر: 9935505839

کچھ ایسی شخصیات ہیں جن کے ساتھ کیفیات اس طرح منسلک ہو جاتی ہیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے ان کا وہ ڈرائنگ روم جہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی پڑا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں اردو انگریزی وہندی زبان کے سلیقے سے رکھے ہوتے اخبارات واردو کی دو ایک اعلیٰ معیاری ادبی جرائد ومیگزینیں بھی اس طرح وہاں ملتیں جن سے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی کہ یہ ایک بڑے علمی و ادبی خانوادہ کا مسکن ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں روزنامہ قومی آواز سے منسلک تھا تو وہاں بار ہا جانے کا اتفاق ہوا لیکن جب ہندوستان کا سب سے بڑا اخبار قومی آواز مرحوم ہو گیا تو راقم الحروف کو روزنامہ راشٹریہ سہارا کی پہلی صف میں شامل ہو کر اس روزنامہ کی نوک پلک سنوارنے کی ذمہ داری کا شرف حاصل ہوا جس وقت راشٹریہ سہارا کی ڈمی چھپ رہی تھی تو سہارا کمپنی کے چیئرمین جناب سبرتو رائے سہارا بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی نمونہ کی کاپیاں لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد اور پٹنہ کے دفاتر کے ذریعہ اردو کے بڑے صحافیوں ادیبوں اور دانشوروں کو ارسال کر کے ان کی قیمتی آرا حاصل کرتے تھے۔ ایسے میں بارہ بنکی کے ایک قدیم زمین دار گھرانے کے اہم رکن اور اردو کے بہترین شاعر و دانشور کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کی ڈمی پابندی کے ساتھ بیگم حامدہ حبیب اللہ کو ارسال کر کے ان سے ان کی قیمتی آرا حاصل کی جا رہی ہیں۔ وہ ہی اپنی سطح پر کچھ ادیبوں شاعروں اور اپنے قریبی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے ان کی کمنٹ حاصل کر کے سہارا شری کو ارسال کرتی تھیں۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ کی شخصیات کئی اعلیٰ قدروں اور صلاحیتوں کا مجموعہ تھی۔ ان کا تعلق چونکہ دکن سے تھا حیدرآباد میں ان کے والد ماجد اسٹیٹ کے چیف جسٹس تھے۔ اس لیے اس عہد کے مطابق بیگم صاحبہ کی تعلیم وتربیت میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی گئی تھی۔ یوں تو اودھ اور حیدرآباد کے بہت قدیم رشتے تھے لیکن ایسے رشتے کم نظر آتے ہیں جو دکنی اور لکھنوی تہذیب کے مابین ایک پل کی شکل اختیار کرتے ہوں۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ اگر ایک طرف بہترین زبان داں انگریزی فارسی اور اردو کے علاوہ آندھرا کی زبان تیلگو سے بھی واقفیت رکھتی تھیں وہ بہترین مدبر، قرآن وحدیث کے اصولوں کی پابند تو منجھی ہوئی سیاست داں تھیں۔

لکھنؤ تہذیب اور اردو زبان کی حفاظت کے لیے جہاں انھوں نے شہر کی اردو شاعرات وخاتون ادیبوں وقلم کاروں کی انجمن بزم اردو کی سرپرست تھیں تو کئی تعلیمی اداروں سے انھوں نے خود کو منسلک کر کے غریب لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک مہم چلا رکھا تھا۔ لکھنؤ کے چکن آرٹ جن کی دھوم پوری دنیا میں مچی ہے۔ کئی صدی سے چکن کاری کا فن بام عروج پر تھا لیکن استداد زمانہ اور جدید ٹکسٹائل ٹکنالوجی جب اس پر حملہ آور ہوتی تو اس کو بچانے کے لیے بیگم صاحبہ آگے بڑھیں اس وقت بھی لکھنؤ میں ایسی ہی ایک تنظیم سیوا ہے، جس کی روح رواں نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا کی مصداق پدم شری محترمہ رونا بنرجی ہیں تو اس ادارہ کی اہم رکن بیگم حامدہ حبیب اللہ بھی تھیں۔ سیوا کا مقصد چکن کاری کے فن میں مہارت رکھنے والی خواتین کو روزگار مہیا کرا کے اودھ کے اس عظیم فن کو بچانا بھی ہے۔

ایک سہ پہر کو باہر سے آنے والے کچھ صحافیوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بیگم حامدہ حبیب اللہ سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے؟ اس وفد میں دو صحافی حیدرآباد کے تھے۔ اس وقت اردو کو آندھرا کے کچھ اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا تھا۔ جب راقم الحروف نے بیگم صاحبہ

سے اجازت حاصل کرنے کے لیے فون کیا تو فوراً انہوں نے حامی بھری اور بولیں کہ ۶ بجے تک آجاؤ جب ہم حضرت گنج میں واقع حبیب اللہ اسٹیٹ پہنچے تو وہاں بارہ بنکی کے ایک انتہائی ذی علم اور مہذیب انسان ہم لوگوں کے خیر مقدم کے لیے باہر کھڑے ملے جن سے مل کر جہاں بے انتہا خوشی ہوئی تو شرمندگی بھی کیوں کہ وہ شخصیت کوئی معمولی حیثیت کی نہیں تھی۔

کرتے بھی کیا اس خانوادہ میں ایسی ہی شخصیات کو اہمیت دی جاتی تھی اس کے لیے یہ سب ان کے عزیز ہوا کرتے تھے۔ جب ہم بیگم صاحبہ کے ملاقاتی وسیع وعریض کمرہ میں پہنچے تو بیگم صاحبہ نے بڑے پر وقار انداز میں ایک بزرگانہ شان و شفقت سے خیر مقدم کیا اور رسمی تعارف کے بعد انہوں نے کانگریس کے ایک سینئر لیڈر اور اس وقت کے وزیر اطلاعات نریش چندر کو مدعو کر رکھا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا نریش سکسینہ کو وہاں بلا کر بیگم صاحبہ نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا پروگرام طے کر لیا تھا اور اردو کو یو پی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں زبر دست تحریکیں چل رہی تھیں کانگریس راضی تھی لیکن کئی وزرا اور تنظیم کے کئی لیڈر بی جے پی اور آر ایس ایس کی زبان بول رہے تھے وہ کسی طرح بھی اردو کو اس کا جائز دینے کے حق میں نہیں تھیں۔ چونکہ بیگم صاحبہ پارٹی کے ریاستی دفتر کے جلسوں اور اسمبلی و کونسل میں اردو کے حق میں بارہا تقریر و تحریر کے ذریعہ اردو کے مقدمہ کو آگے بڑھایا تھا اس لیے اس ماحول میں اس موضوع پر خود کچھ کہنے کے بجائے کانگریس کے وزیر اور دوسرے اہم لیڈروں کو بلا لیا تھا۔ انہوں نے اپنی جانب سے انگریزی اور ہندی کے کئی اچھے رپورٹروں کو بھی اطلاع دے دی تھی جس سے یہ رسمی ملاقات انتہائی اہم اور بڑی خبر بن کر لکھنؤ، کانپور، حیدرآباد کے اخبار کے صفحہ اول کی زینت بنی۔ اس طرح اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے جدو جہد کرنے والوں کو بڑا حوصلہ ملا۔ یہ تھی بیگم حامدہ حبیب اللہ کی اردو سے محبت اور زبان سے وفاداری کی عظیم مثال۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ کی ذہانت اور ان کی نرم مزاجی و شاندار انداز گفتگو سے ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بہت متاثر تھیں اس لیے ہر الیکشن کے موقع پر مسلم امور سے متعلق مسائل پر بیگم حامدہ حبیب اللہ سے صلاح و مشورہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ جدید دور میں قدیم تہذیب کا بھی بڑا خیال کرتی تھیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے اے پی سین ہال میں ایک مشاعرہ چل رہا تھا۔ ملک کے مشاہیر شعرا کی شرکت تھی۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی یہ کوئی گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی کا زمانہ ہے ڈائس پر گورنر اتر پردیش اکبر علی خان مرحوم بھی جلوہ افروز تھے۔ ہال میں شور بہت ہو رہا تھا۔ یہ اچھے شعر پر داد دینے کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس لیے ماحول میں بدمزگی گھل گئی تھی ایسے جب شور مزید بڑھا تو بیگم حامدہ حبیب اللہ بڑی سرعت کے اٹھ کر مائک پر آئیں اور دو بار تالی بجا کر حاضرین کو مخاطب کیا۔ حال میں اچانک سناٹا چھا گیا۔ بیگم حامدہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ اچھے کلام پر داد دینے سے آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ آپ کا حق ہے لیکن غیر ضروری شور نہیں ہونا چاہئے اس کے بعد وہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئیں مشاعرے کے اختتام تک مجال کیا ہے کہ کسی نے شور مچانے کی جرأت کی ہو۔

بیگم صاحبہ انتہائی مخیر، صوم وصلوٰۃ کی پابند اور قوم کی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ آج وہ عظیم شخصیت ہمارے درمیان نہیں رہیں لیکن غریب بچیوں میں جو علم کی روشنی انہوں نے پھیلائی ہے اس کے ضوفشانی انشاءاللہ تا قیامت برقرار رہے گی۔

جس وقت وہ اتر پردیش اردو اکادمی سے منسلک تھیں تو اردو زبان و ادب کے لیے بڑا کام کیا۔ ان کے عہد میں اگرچہ اکادمی کی گرانٹ اس وقت بہت کم تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے اردو کے کاز کے لیے کبھی پیسے کی کمی نہیں ہونے دی۔ جس طرح فوج سے سبکدوشی کے بعد ان کے شوہر جنرل حبیب اللہ اردو کے ایک خاموش خادم بن کر زندگی بھر کام کرتے رہے بیگم صاحبہ نے اس روایت کو آخری سانس تک برقرار رکھا ۱۰۲ برس کی عمر کے بعد آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی کاوشیں قدم قدم پر دانش علم و ہنر کو یہ محسوس کراتی ہیں۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

•••

تذکرہ نویسی کے خدوخال

ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری

اسسٹنٹ پروفیسر،

ماکھن لال چترویدی گورنمنٹ گرلس پی جی کالج

کھنڈوہ (ایم پی) موبائل نمبر۔ 9753210869

تذکرے ہمارے ادب کا ابتدائی سرمایہ ہیں، اس کی قدامت میں بھی اہمیت پوشیدہ ہے۔ تذکرہ نویسی ہمارے یہاں بطور ایک فن اور صنفِ ادب کے مستعمل ہے۔ اردو میں تذکرے اس وقت وجود میں آگئے تھے جب فارسی کا رواج عام تھا اور اردو اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی۔ اس وقت بھی تذکرہ نویسی کا شمار اردو کے ابتدائی نثر میں ہو رہا تھا۔ بہت سی نثری اصناف کی ابتدا تذکروں سے ہوتی ہے، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کئی اصناف کی ابتدا کا سہرا انہیں تذکروں کے سر ہے۔ اردو میں تحقیق کی ابتدا بھی کی بات ہو، یا تنقید کی، اسی طرح خاکہ و مرقع نگاری، سوانح نگاری اور تبصرہ نگاری وغیرہ کے ابتدائی نقوش بھی انہیں تذکروں میں ملتے ہیں۔ یعنی کئی اصناف کے سوتے تذکروں سے ہی پھوٹے ہیں۔ الغرض یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ متعدد اردو اصناف کا جدامجد تذکرے ہی ہیں۔

فارسی وعربی شعروادب کی ابتدائی تاریخیں اور بطورِ خاص اردو ادب کی اولین تاریخیں تذکروں پر ہی مشتمل ہیں۔ تذکرہ نویسی کی اپنی خصوصیات ہیں جسے سمجھنے کے لیے اس کے لفظی واصطلاحی معنی پر توجہ دینا ضروری ہے۔ عربی لفظ ''ذکر'' سے ''تذکرہ'' وجود میں آیا۔ یہ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو زبان میں منتقل ہوا۔ معروف محقق حنیف نقوی نے 'المنجد فی اللغہ'، شبلی نعمانی کی مشہور اردو تصنیف 'سفر نامہ مصر و روم و شام' اور 'قرآن کریم' کی مختلف سورتوں کے حوالے سے تذکرہ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''تذکرہ ایک عربی لفظ ہے جسے اہلِ زبان یادداشت (میمورنڈم)، دستاویز یا سرٹیفکٹ، ریل یا جہاز کے ٹکٹ اور پروانہ راہداری یا پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس سے بالعموم نصیحت اور تفہیم کے معنی مراد لیے گئے ہیں۔ لیکن فی زمانہ فارسی و اردو میں اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو۔'' [1]

مختلف لغات میں لفظ ''تذکرہ'' کے اور بھی کئی معنی ملتے ہیں مثلاً چرچا کرنا، یادگار، بیان، سرگزشت اور سوانح عمری وغیرہ۔ [2]

اردو شعرا کے حالات و کوائف پر مشتمل تذکروں پر اہم تحقیقی کام حنیف نقوی نے کیا ہے۔ موصوف نے اپنی تحقیق میں فارسی و اردو میں لکھے گئے متعدد تذکروں کی دریافت بھی کی، نیز تاریخِ ادب اور بیاض وغیرہ کے فرق کو بھی واضح کیا۔ بحث و تمحیص کے بعد موصوف نے صنفِ تذکرہ کے خدوخال بھی بیان کیے اور عمدہ طور پر تذکرہ کی جامع تعریف بھی متعین کی، وہ لکھتے ہیں:

''غرض یہ کہ مروجہ اصطلاحی مفہوم کی روشنی میں صرف وہی کتابیں ''تذکرہ'' کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دونوں عناصر (مختصر حالات اور منتخب کلام) اِس صنفِ ادب کے وہ بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جن کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی و استادی کے روابط، مزاج وطبیعت کی افتاد، تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے مذاق و معیار کے متعلق ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر

متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسری اصنافِ سخن کے اقتباسات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ ترتیب کے اس بنیادی اصول کو برقرار نہ رکھتے ہوئے اگر کسی کتاب میں محض ہر شاعر کے نام اور تخلص کے ساتھ مختلف شاعروں کا کلام یکجا کر دیا جائے تو اسے ''تذکرہ'' کے بجائے ''بیاض'' کہا جائے گا، جب کہ زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور کلام کے متلق مفصل بحث کی صورت میں ایسی کتاب ''تاریخِ ادب'' کی تعریف میں آئے گی۔'' [3]

اس طرح تذکرہ کی اپنی صنفی حیثیت ہے۔ تمام تخلیقات اور شہ پاروں کے وقوع پذیر ہونے کے پیچھے ضرور کچھ نہ کچھ وجوہات واسباب ہوتے ہیں۔ اسی طرح تذکروں کے وجود میں آنے کے بھی متعدد اسباب رہے ہیں۔ تذکرہ نگاری کے پس پشت جو اہم عوامل کارفرما ہیں ان میں بطورِ خاص: بقائے نام کی آرزو، اربابِ کمال کی قدر شناسی، ادبی وتحقیقی ذوق کی تکمیل، معاصرانہ چشمک اور ادبی گروہ بندی، احباب کی فرمائش، سرپرستوں کی خوشنودی، پسندیدہ کلام کی ترتیب وغیرہ ایسی وجوہات ہیں جو تذکرہ نویسی کا محرک بنے۔

تذکروں میں موجود مواد اور ادبی اطلاعات کو دیکھتے ہوئے اِس کی ادبی وتاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تذکروں سے تاریخِ ادب کو بڑا فیض پہنچا۔ بے شمار شعرا وادبا جن کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا اُنہیں تذکروں کی بدولت ہی بقائے دوام حاصل ہوا۔ ادبی مراکز سے دور دراز علاقوں اور چھوٹے چھوٹے غیر معروف مقامات پر لاتعداد تخلیق کار، شعرا وادبا نے جنم لیا، جنہوں نے اپنے اپنے طور پر زبان و ادب کی خدمت کی، اُن کا ذکر تذکروں میں درج ہونے سے ان کا نام ونشان محفوظ رہ گیا۔ یوں یہ شعرا وادبا اپنے شایانِ شان نہ سہی، لیکن کچھ مقام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اسی طرح بہت سے ادبی امتیازات، میلانات، رجحانات اور عہدِ رفتہ کے کمیاب ونایاب تخلیقی شہ پاروں کا پتہ بھی ہمیں محض ان تذکروں میں ملا۔ اگر یہ تذکرے نہ ہوتے تو قارئینِ ادب ضرور ان اہم ادبی کارناموں سے ناواقف رہ جاتے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ادبی آگہی کا اہم ذریعہ یہی تذکرے ہیں، اور یہ کہ شعری وادبی بازیافت کا ناقابلِ فراموش کام ان تذکروں کی بدولت سرانجام پایا۔ اس ضمن میں حنیف نقوی فرماتے ہیں:

''تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر فنا ہو چکی ہیں یا جن کے بارے میں معلومات کا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں۔ بطور مثال میر حسن نے انعام اللہ خاں یقین کے ذکر میں ''نکات الشعرا'' کا ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جو اس کے گم شدہ ایڈیشن سے تعلق رکھتا ہے، یا مولوی کریم الدین نے ''طبقات شعرائے ہند'' میں فضلی کی ''کربل کتھا'' کی ایک طویل عبارت بطور نمونہ پیش کی ہے۔ یہ کتاب جو شمالی ہند کی اردو نثر کا بالکل ابتدائی نمونہ ہے اور حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے، اب سے کچھ پہلے تک گم شدہ شاہکاروں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس کی تلاش ودریافت بڑی حد تک کریم الدین کے اسی حوالے کی رہینِ منت ہے۔'' [4]

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ تحقیق کے بنیاد گزار یہی تذکرے ہیں۔ تحقیقی وتنقیدی نقطۂ نظر سے جہاں ان تذکرں میں بہت سی خوبیاں ہیں وہیں خامیاں بھی ہیں۔ اردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء سے زمانۂ میر تک تحقیق وتنقید کی کوئی قابلِ ذکر روایت نہیں ملتی۔ مشاہیرِ ادب تذکروں سے ہی اردو تحقیق وتنقید کا آغاز وارتقاء تصور کرتے ہیں۔ یہ تذکرے تھے تو فارسی زبان میں مگر اردو شاعروں کے حالات وکوائف پر مشتمل تھے۔ حالانکہ یہ تحقیقی وتنقیدی نقطۂ نظر سے تحریر نہیں کیے گئے تھے اور نہ ہی اس کے لکھنے والے کسی تحقیقی وتنقیدی اصول سے واقف ہی تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے اردو شاعروں کے جو تذکرے تحریر کیے وہ جدید تحقیق وتنقید کی رو سے ناقص اور نامکمل ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں، اوّل تو یہ تذکرہ نگار تحقیق کے جدید اور سائنٹیفک اصولوں سے ناواقف تھے۔ دوسرے یہ کہ اِن کا منشاء کوئی تحقیقی شہ پارہ پیش کرنا نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ ان سے جیسا بن پڑا لکھ گئے۔ ان تذکروں کو تحقیق کی کسوٹی پر ہم آج پرکھتے ہیں تو اس میں متعدد خامیاں اور کمیاں نظر آتی ہیں۔ بعد کے محققین نے ثابت کیا کہ کہیں کسی شاعر کی کوئی تاریخ پیدائش غلط ہے، کہیں کوئی واقعہ درست نہیں اور کہیں

اشعار کی صحت مشکوک ہے۔ جدید تحقیق نے ان تذکروں میں اس قسم کی متعدد غلطیاں تلاش کیں۔ کبھی کبھی تذکرہ نگار شاعر کی تضحیک کرتا بھی نظر آتا ہے، جو اصولِ تحقیق کے موافق نہیں۔ اِس کے باوجود ہماری تحقیق کا نقطۂ آغاز یہی تذکرے ہیں، کیوں کہ تحقیقی اشارے یہیں سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں گیان چند جین فرماتے ہیں:

''مجھے اعتراف ہے کہ تذکروں میں تفحص کے بجائے تساہل سے کام لیا گیا ہے حالات کے جمع کرنے میں کد نہیں کی گئی۔ جس کے بارے میں جو کچھ تھا وہی زیبِ قرطاس کر دیا، کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو 'از دست' ہی پر اکتفا کر لی گئی۔ لیکن اکثر تذکروں میں چند شعراء کے حالات میں کچھ کام کی باتیں اور کچھ تفصیلات مل جاتی ہیں۔ . . . . محقق کا کام ہے کہ ان کو چھان پھٹک کر ایک صحیح نقشہ تیار کر سکے اردو کی ادبی تحقیق کا پہلا قدم، پہلی منزل تذکرے ہیں۔'' [5]

بہر حال تذکروں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے قطع نظر اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں تذکروں کی بے مثال ادبی خدمات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے میر کے 'نکات الشعراء' سے۔ معروف محقق حنیف نقوی نے باعتبارِ قدامت 'نکات الشعراء' کو تذکروں میں اوّلیت کا تاج پہنایا ہے اور اس کی تکمیل کا سن ۱۷۵۱ء سے ۱۷۵۲ء کے درمیان بتایا ہے۔ [6] اس کے علاوہ سید فتح علی گردیزی کا 'تذکرہ ریختہ گویاں'، حمید اورنگ آبادی کا 'گلشن گفتار'، قائم چاندپوری کا 'مخزن نکات' اور عنایت اللہ فتوت کا 'ریاض حسنی' تذکروں کی ترتیب ملتی ہے۔ یہ سب تذکرے 'نکات الشعراء' کے فوراً بعد ہی تکمیل پذیر ہوئے۔ دکنی شعرا کے احوال کے لیے ''تذکرۂ شعرائے دکن'' تحریر کیا گیا۔ اسی طرح شعرالہند، مخزن الشعرا، تذکرۂ ریختی، مجموعۂ نغز، تذکرہ ماہ وسال، بے شمار تذکرے تحریر کیے گئے، کس کس کا ذکر کیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی قلم کاروں نے تذکرے لکھے۔

سعادت یار خاں رنگین کا 'خوش معرکۂ زیبا'، قادر بخش کا 'گلستانِ سخن'، نساخ کا 'سخن شعراء'، امیر مینائی کا 'انتخاب یادگار' اور محمد حسین آزاد کا 'آبِ حیات' وغیرہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ تذکرہ نگاری کا یہ سلسلہ اٹھارویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک قائم رہا۔ اِن تمام تذکروں میں محمد حسین آزاد کا 'آبِ حیات' ایک بہترین مثال ہے۔ اس سے قبل کے تذکروں سے ذرا ہٹ کر آزاد نے کچھ مفصّل انداز اپنایا، شاعروں کے سوانحی کوائف کو ذرا تفصیل سے درج کیا اور نہ صرف ان شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا بلکہ اردو ادب میں ان کا مقام ومرتبہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ غالباً یہ اردو کا ایسا پہلا تذکرہ ہے جسمیں تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلوؤں سے گفتگو کی گئی۔

تذکرہ نویسی کی رفتار وہاں سست پڑنے لگی جہاں تاریخ، تنقید، سوانح اور خاکہ وغیرہ پر مشتمل مستقل کتابیں تحریر کی جانے لگیں۔ لیکن تذکرہ نویسی کا فن پھر بھی زندہ رہا۔ دورِ حاضر میں بھی مختلف شہروں کے تذکرے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جو دلچسپی سے پڑھے جا رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تذکرہ نگاری صرف عہدِ رفتہ کا واقعہ نہیں بلکہ دورِ حاضر کا نقیب بھی ہے۔

حواشی: --۱۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۹

۲۔ پروفیسر مجید بیدار، اردو کی شعری ونثری اصناف، حیدرآباد ۲۰۱۴، صفحہ ۱۶۲

۳۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۳

۴۔ ایضاً صفحہ ۳۶

۵۔ عبدالستار دلوی (مرتبہ) اردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے، مشمولہ 'ادبی ولسانیاتی تحقیق اصول اور طریقہ کار' بمبئی یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء صفحہ ۲۰۴

۶۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۸۲

•••

ماہنامہ ”کتاب“ کا الوداعی شمارہ

ادبی خراج

ڈاکٹر شکیل احمد
قاسمی منزل، ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن
موبائل نمبر 9236722570

اپنے وقت کے موقر اور ذہن ساز ادبی ماہنامے ”کتاب لکھنؤ“ کے علمی و ادبی نقوش اب صرف اس کے خستہ صفحات اور ادب دوست شخصیات کے ذہنوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ وجہ صاف اس کا الوداعی شمارہ فروری تا جولائی ۱۹۷۵ء پر مشتمل خاص نمبر کے بطور شائع ہوا تھا۔ جس کو اب بیالیس برس ہو گئے۔ اس لیے نئی نسل صرف اس کا نام سن رہی ہے یا جہاں تہاں محفوظ اس کے شماروں کا مطالعہ کر کے اس کی علمی و ادبی اہمیت کا اندازہ کر سکتی ہے۔

اکیسویں صدی آتے آتے ایک نسل جس نے ”کتاب“ کے صفحات پر اپنی نگارشات کو جگمگ دیکھا تھا، وقت کے ہاتھوں خود ان کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ پھر بھی شعرا اور ادبا کی ایک تعداد اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے جنھوں نے ”کتاب“ میں اپنی نگارشات کو شایع ہوتے اور قارئین کے درمیان ان کی پذیرائی دیکھی تھی یہ شخصیات اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اب گزشتہ چار دہائی کے دوران اہم ادبی سفر طے کر کے قدر و منزلت کی بلندیوں پر سرفراز ہیں۔ رسالہ ”کتاب“، لکھنؤ کے تعلق سے ہم فارسی کا یہ شعر دہرا سکتے ہیں:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں، ایں قصہ پارینہ را

”اگر آپ سینے کے داغوں کو تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو کبھی کبھی پرانے قصے کو پڑھتے بھی رہیے“

اردو کے کس ادبی جریدے کو حیات دوام، یا طویل زندگی نصیب ہوئی جو ”کتاب“ کو مل جاتی ”معارف“ اعظم، ”شاعر“ ممبئی یا ”آجکل“ اور ”نیا دور“ جیسے رسائل کے علاوہ بہت کم رسائل کو ہی اپنی اشاعت کی سلور جبلی یا گولڈن جبلی نصیب ہو سکی ہے خیر ”معارف“ نے تو اپنی صدی پوری کر لی۔ اسی کلیہ کے زیر اثر ”کتاب“، لکھنؤ بھی شوش درخشید و لے شعلہ مستعمل بود“ ثابت ہوا اور اپنی گراں قدر ادبی اور صحافتی جذبات کے روشن نقوش قائم کر کے یکا یک خاموش ہو گیا“ دسمبر ۱۹۶۲ء میں جو سفر شروع ہوا تھا۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں ۱۲ برس ۸ ماہ بعد ختم ہو گیا۔ الوداعی شمارہ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ اور ۱۳۰ پر مشتمل ہے۔ ۲۱۶ صفحات کی اس خاص اشاعت کے سرورق پر نذر سجاد ظہیر اور احتشام حسین تحریر ہے۔ نومبر ۱۹۷۰ء کے افسانہ نمبر اور جنوری ۱۹۷۳ کے خاص نمبر تیسرا حصہ کے شمارہ میں مجلس مشاورت کے تحت حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی اور عابد سہیل کے نام شایع ہوئے ہیں وہیں اس الوداعی شمارہ میں ڈاکٹر قمر رئیس کے نام کا اضافہ ہے۔ بہ حیثیت ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشرز شمیم الوین کا نام اور طباعت نامی پریس لکھنؤ اور پتہ ہر شمارہ کی طرح کپور مارکیٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ شایع ہوا ہے۔

الوداعی شمارہ کے مشمولات کے ذکر سے پہلے آخری صفحات ۲۱۴، ۲۱۵ پر شائع ”الوداعیہ“ سے چند جملے ضرور نقل کرنا چاہوں گا جس سے مرتب یا ”کتاب“ کے روح رواں عابد سہیل مرحوم کے درد کا احساس کیا جا سکے اور کن مشکل حالات میں اس کے شمارے شائع ہوتے اور ادبی حلقوں میں بہ نظر ستائش دیکھے اور پڑھے جاتے تھے اس کا کچھ

کچھ اندازہ چار دہائیوں کے بعد بھی کیا جا سکے۔ اردو کیا ادبی رسائل کے لیے آج کی بہ نسبت پہلے بھی مشکلات کم نہ تھیں اس کے باوجود کتاب کا الوداعی شمارہ شایع ہوا اور اب اس کے مرتب کے یہ یادگار جملے ہمارے ذہن و فکر کو جھنجھور رہے۔ ”کتاب“ کی پشت پناہی کے لیے نہ تو کوئی سرمایہ تھا نہ سرمایہ دار۔ بس ایک جنون تھا جو پھیلا تو اس نے اردو کے درجنوں اہل قلم اور ادب دوست حضرات و خواتین کو رسالہ کی مدد، معاونت اور حمایت پر کمربستہ کر دیا اور کبھی سکڑا تو ایک دل کے نہاں خانہ کی مایوسی بھی دور نہ کر سکا۔ کبھی رجائیت کی پھوار پڑی تو اسے ہندو پاک کا سب سے خوبصورت، سب سے اچھا ماہنامہ بنا دینے کا خواب دل و دماغ میں انگڑائیاں لینے لگا اور کبھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے گھیرا تو اگلا شمارہ وبال جان بن گیا۔“ صفحہ ۲۱۴۔

”.....نہ کردن یک عیب۔ کردن صد عیب سے قطع نظر اس سارے دوران مضامین کے انتخاب میں ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں کو ہمارے انتخاب سے اختلاف رائے بھی رہا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ان کی اچھی چیزیں مسترد کر دی گئیں۔ ہم اپنی غلطیوں، کوتاہیوں، کمزوریوں اور معذوریوں کے لیے کتاب میں لکھنے والوں، قارئین اور ان لوگوں سے جن کی چیزیں شایع نہ ہو سکیں، معذرت خواہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ”کتاب“ کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اس کی جگہ پر کرنے کے لیے بہتر، زیادہ معیاری، زیادہ خوبصورت اور زیادہ پابند وقت رسالہ ضرور نمودار ہوگا اور ان کمیوں کی تلافی کر دے گا جن کا ”کتاب“ کے علاوہ دوسرا نام عابد سہیل تھا۔“

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

صفحہ نمبر ۲۱۵۔

”کتاب“ کے تنوع اور جہات کے اندازہ کے لیے بالترتیب شمارہ ۱۲۷ سے ۱۳۰ کی فہرست مضامین درج کر رہا ہوں جن میں ذیلی عنوان کے تحت مضامین یا منظومات اور قلم کار یا شاعر کا نام پیش کیا گیا ہے۔

شمارہ ۱۲۷..............تنقید کے مسائل ....اردو ادب میں عصری آگہی...............صفحہ ۷ سے ۶۵ تک
تنقید اور عصری آگہی...............ڈاکٹر محمد عقیل
جدید ادبی تنقید، چند مسائل...............ڈاکٹر شارب ردولوی
تقاضائے آگہی...............ڈاکٹر صدیق الرحمٰن
اردو تنقید انتظار میں ہے...............ڈاکٹر افصح ظفر
افسانہ کے مسائل...............آزادی کے بعد
افسانہ اور عصری آگہی...............رضیہ سجاد ظہیر
عصری آگہی اور افسانہ حد افسانہ...............انور عظیم
اہل، کمل، بمل...............اقبال مجید
افسانہ، زبان، علامت...............عابد سہیل
رپورٹ...............ہلکا ہلکا دودھیا رنگ سحر...............عبدالحیٔ
شمارہ۔ ۱۲۸۔ گوشہ سجاد ظہیر: صفحہ ۶۶ سے ۱۰۴ تک
کیا دوانے نے موت پائی ہے...............سلام مچھلی شہری
بنے بھائی: ایک تاثر...............اشفاق حسین
لندن کی ایک رات...............قمر اعظم ہاشمی
عالمی برادری کی تشکیل (انٹرویو)...............ابوالفیض سحر
منظومات: انیس اشفاق۔ مغیث الدین فریدی۔ اجمل اجملی۔ رعنا حیدری
مقالے: مراٹھی زبان کا انقلابی شاعر...............سردار جعفری
خط نگاری...............عبدالقوی دسنوی
جدید شاعری اور جنسیت...............تصدیق سہاوری (مرحوم)
(باقر مہدی سے ایک گفتگو)
تحلیل نفسی: انتقادی جائزہ...............اصغر علی انجینئر
شمارہ۔ ۱۲۹...............صفحہ ۱۰۵ سے ۱۶۰ تک
افسانے: پرکاشو...............غیاث احمد گدی...............پل دو پل...............انور عظیم

شبنم کی پیاس ....مصطفیٰ کریم ....میزبان؟
سلطان سبحانی
متوازی لکیریں ....محسن شمسی ....فرکشن
............ابرارالیقین
جاگتی آنکھوں کا خواب............رشید امجد............سورج
ڈوبا تھا نہ ابھرا تھا............شوکت حیات
ایک کہانی ....حسین الحق ....رنگ پس رنگ
............سجادعزیز
سادھان ....اے کے ندیم ....درد کا رشتہ (
عربی کہانی)............طٰہٰ حسین
طنز و مزاح : ذکر ادبی رسائل کا ....ابن انشاء
............ترجمہ سرینواس لاہوتی
ہم شیر اور چھٹی حس............حمید عثمانی

شمارہ۔۱۳۰۔۔۔۔صفحہ ۱۶۱ سے ۲۱۶ تک

نظمیں :۔نظم ....سلام مچھلی شہری ....اے
سمندر کیا ہے تو دھاکے ابال............عمیق حنفی
سمندر پر بارش ....بلراج کومل ....بے
جواب سوالات ....وحید اختر
اخبار کا تراشا ....بلراج کومل ....ہم خوش
نہیں ....صادق
بے مقامی ....وحید الحسن ....خالق
............اجمل اجملی
سوالیہ نشان ....طارق سبزواری ....شام
............اجلال مجید
خرید و کوئی ....شاہین ....میں اور تم ایک نظم ر
کسی دن............بلدیو مرزا
بمبئی ....رباب جعفری ....میں کہ ایک لفظ
ہوں ....حمید سہروردی
ایک نظم ....فخر رضوی ....ادیب وفنکار رسفر
............افغان اللہ خاں
نظم ....کرشن مراری ....سڑکوں سے تلووں کا
رشتہ ....عقیل شاداب
بارش ....احتشام اختر ....نظمیں
............رؤف صادق
محمد رسول اللہ ....ادیب حسن ....تلقین
............فیروز
دنیا ....نیاز اشرف ....میں نہیں ہوں
رموضوع کا انتقال............انور مسعود
بنام خدا ....مظہر مہدی ....تماشے کی چڑیا
............رشید عبدالسمیع جا
دوسرا رخ ....خلیل رمزی

غزلیں: فضا ابن فیضی، مظہر امام، بشیر بدر، شہریار، مدحت الاختر، مظفر حنفی، غلام مرتضیٰ، انیس الرحمٰن، صادق، مہدی پرتاپ گڑھی، عبد الرحیم نشتر، موسیٰ مجروح، حکیم منظور، تابش علیمی، اختر علیم، فاروق شفق، اشہر ہاشمی، پرکاش فکری، ظہیر صدیقی، مصور سبزواری، شاہین، منظور ہاشمی، ظفر عذری، وقار ناصری، ناز قادری، پرتپال سنگھ بیتاب، جمنا پرساد، ذکاءالدین شایاں، رشید افروز، ڈاکٹر زکیہ انجم، غلام حسین ایاز، مظفر مجاز، افضل اجملی، یوسف جمال، ظہیر انور، ندیم الواجدی، علی الدین نوید

نظم: اور میں آؤں گا رتنہائی، پابلو نرودا ا ترجمہ زاہدہ زیدی
شاعری ....پابلو نرودا............ترجمہ زاہد زیدی
تبصرے : گناہ کا رشتہ (افسانے) ....بانک نالہ
مبصر ....صفدر آہ
لکھنؤ کے چند نامور شعراء، (تنقید و تعارف) ڈاکٹر سلیمان
حسین، مبصر مسیح الزماں

دیوانجلی، (شاعری)، ساغر مہدی، مبصر (ڈاکٹر) نیر مسعود
تند، شیریں: مراسلہ نگار۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ حیات اللہ انصاری۔ سلیم شہزاد۔ اصغر علی انجینئر

مراسلے۔ سلیمان اطہر جاوید۔ مہدی پرتاپ گڑھی۔ عبدالقوی دسنوی الغرض شمارہ نمبر ۱۳۰ میں ۴۲ غزلیں۔ ۳۹ نظمیں۔ ۳ منظوم تراجم۔ ۳ کتابوں پر تبصرے اور ۷ عدد فکر انگیز خطوط بطور مراسلہ شائع ہوئے۔

مضمون کے آغاز میں ''الوداعیہ'' کی سطریں نقل کر چکا ہوں۔ یہ تحریر ادھوری محسوس ہوگی اگر صفحہ ۲۱۳ پر شائع ''اداریہ'' کو نقل نہ کیا جائے اس لیے بدلتے ہوئے ادبی، سیاسی اور سماجی و معاشی حالات کے تناظر میں اس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا:

''ترقی پسند ادبی تحریک کی شیرازہ بندی کی کوششیں ایک عرصہ سے کی جا رہی تھیں۔ تقریباً دو سال قبل دہلی سیمینار بھی انہی کوششوں کا ایک حصہ تھا۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے اہم کوشش مئی کے اوائل میں ''گیا'' بہار میں ایک ایسی کل ہند کانفرنس کی شکل میں ہوئی جس میں ملک کی تقریباً ساری ہی زبانوں کے سو سے زیادہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس نے جس کا افتتاح ڈاکٹر عبدالعلیم نے کیا تھا، ایک منشور بھی منظور کیا جس میں بین الاقوامی اور قومی صورت حال کا تجزیہ کر کے ان راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر چل کر ترقی پسند طاقتوں کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔

ادب اور زندگی کے رشتوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس منشور میں کہا گیا ہے کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر فرقہ پرستی، منفی رویہ، قنوطیت، آدم بیزاری، شکست خوردگی اور محرومی کے ادب کو مسترد کرتے ہیں کہ انہیں انسان، اس کی صلاحیتوں اور اس کے روشن مستقبل پر ایمان ہے۔ یہ ایمان ادب کو حسن دلکشی اور توانائی بخشتا ہے۔

کانفرنس نے فسطائیت پر فتح کی ۳۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ایک اعلانیہ بھی منظور کیا جس میں کہا گیا ہے کہ فسطائیت، علم، ادب اور تہذیب کی دشمن ہے۔ چنانچہ اس کا اصل ہدف ترقی پسند افکار و خیالات اور ترقی پسند ادیب ہی ہوتے ہیں۔ اس اعلانیہ میں ادیبوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ملک میں رجعت پرستی اور فسطائیت کے سر اٹھاتے ہوئے فتنہ کے خلاف متحد ہو جائیں۔

کانفرنس نے ایک دوسری قرارداد کے ذریعہ اردو کو اس کے قانونی حقوق دینے کا بھی مطالبہ کیا۔ اس قرارداد کی تائید ساری زبانوں کے ادیبوں نے کی اور یہ قرارداد بھی متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

ملک کے موجودہ حالات (۱۹۷۵ء میں) ادیبوں اور دانشوروں کے لیے ایک لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کے ادیب، ادب اور زندگی کی ترقی پسند، جمہوری اور سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانے میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔''

''کتاب''، لکھنؤ کے اس الوداعی شمارے کے آخر میں صفحہ ۲۱۳ پر اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دینے والی اردو زبان و ادب کی دو اہم شخصیات ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر اعجاز حسین صاحبان کے اچانک انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے ان جملوں میں یاد کیا گیا ہے:

''ڈاکٹر مسیح الزماں۔ تنقید کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جو ادب اور زبان کو ان تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کا شمار اردو کے ان نقادوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کئی نسلوں کا ادبی تربیت علم و ادب کے سنجیدہ قارئین اعجاز صاحب کی تصانیف سے ایک عرصہ بصیرت حاصل کرتے رہیں گے۔

اردو کے ادبی جرائد کا نکلنا اور بند ہو جانا ایک عام سا واقعہ اگرچہ لگتا ہے لیکن ہر رسالہ کی اشاعت کا آغاز اور کچھ مدت کے بعد نا مساعد حالات کے تحت ان کی اشاعت کے بند ہو جانے کے پیچھے ہم اردو والوں کی کوتاہیاں ضرور شامل حال ہوتی ہیں۔ صدیوں سے ہمارا مزاج رہا ہے کہ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے نام پر اپنی آمدنی کا ایک مختصر سا حصہ بھی مختص نہیں کرتے۔ ہم میں سے ایک بڑی تعداد ان کی خریداری کو اپنے پیسوں کی بربادی سمجھتی ہے۔

............بقیہ صفحہ ۴۷ پر

غزل

پروفیسر شہپر رسول
صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
موبائل نمبر 9891721187

میری نظر کا مدعا اُس کے سوا کچھ بھی نہیں
اُس نے کہا کیا بات ہے میں نے کہا کچھ بھی نہیں

ہر ذہن کو سودا ہوا ہر آنکھ نے کچھ پڑھ لیا
لیکن سرِ قرطاسِ جاں میں نے لکھا کچھ بھی نہیں

دیوارِ شہرِ عصر پر کیا قامتیں چسپاں ہوئیں
کوشش تو کچھ میں نے بھی کی لیکن بنا کچھ بھی نہیں

جس سے نہ کہنا تھا کبھی جس سے چھپانا تھا سبھی
سب کچھ اُسی سے کہہ دیا مجھ سے کہا کچھ بھی نہیں

چلنا ہے راہِ زیست میں اپنے ہی ساتھ اک عمر تک
کہنے کو ہے اک واقعہ اور واقعہ کچھ بھی نہیں

اب کے بھی اک آندھی چلی اب کے بھی سب کچھ اُڑ گیا
اب کے بھی سب باتیں ہوئیں لیکن ہُوا کچھ بھی نہیں

دل کو بچانے کے لیے جاں کو سپر کرتے رہے
لوگوں سے آخر کیا کہیں شہپر بچا کچھ بھی نہیں

•••

غزل

عبدالواحد تنویؔر راویری
امبر ناتھ، ضلع تھانہ۔ ممبئی
موبائل 9022894397

بیٹھ کے میرے سامنے گھنٹوں بَس مُسکاتے رہنا تُم
جب تک اپنے ہوش نہ کھو دوں جام پلاتے رہنا تم

شام سویرے دِل میں میرے آتے جاتے رہنا تُم
اپنے حسیں جلوؤں سے درپن روز سجاتے رہنا تم

رنج والم کی تاریکی میں چھوٹ نہ جائے ساتھ کہیں
راہِ محبت میں خُوشیوں کے دیپ جلاتے رہنا تم

تنہائی کے عالم میں جب کوئی تمہارے پاس نہ ہو
مَن مندر میں جوت جگا کر گیت سُناتے رہنا تم

مُشکل سے تعمیر ہُوا ہے اپنا نشیمن یاد رہے
لازم ہے شعلوں کی نظر سے اِس کو بچاتے رہنا تُم

یاد رہے روتوں کو ہنسانا بھی ہے عبادت میں شامل
اس کرتب کا سارے جہاں میں رنگ جماتے رہنا تم

تُم بھی کِسی معصوم کے ارمانوں کی انوکھی دُنیا ہو
تنویر اپنے آپ کو یہ احساس دِلاتے رہنا تم

•••

کئی چاند تھے سرِ آسماں

تنقیدی جائزہ

ذاکر حسین
شانتی نگر وارڈ نمبر 7 مہوا باری ضلع دیوریا۔ یو پی۔274001
موبائل 9415276138

کئی چاند تھے سرِ آسماں اردو کا پہلا تاریخی تحقیقی و دستاویزی ناول ہے جس میں تاریخ فہمی اپنے پورے شباب پر ہے۔اس ناول کے خالق مشہور نقاد اور محقق شمس الرحمٰن فاروقی نے اگر زور دے کر اس تخلیق کو ناول قرار نہ دیا ہوتا تو اس کے صنف کے تعین میں خاصی دشواری پیش آتی۔مگر فاروقی کے اس بیان کے بعد کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

’’یہ تاریخی ناول نہیں ہے اسے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسان اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔‘‘

اردو میں اس طرح کے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔آج سے پچاس سال قبل شعور کی رو کی تکنیک میں قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول آگ کا دریا منظر عام پر آیا جس نے کئی اعتبار سے بحر ادب میں تلاطم برپا کر دیا۔آگ کا دریا نے اردو کا دامن وسیع کرنے کے ساتھ ہی ادب میں پریم چند کے طلسم کو توڑنے میں بھی کامیابی حاصل کی ،مگر کئی چاند تھے سرِ آسماں کی بیانیہ طرز میں اینگلو اسلامی تہذیبی تصادم کی منظر کشی دل پر گہرائی تک اثر انداز ہوتی ہے۔اسی وصف نے اس ناول کو ایک یادگار دستاویز بنا دیا۔اس ناول کی لفظیات میں جو سحر انگیز تاثیر ہے وہ قاری کو انہماک ودلچسپی کے سمندر میں غوطے لگانے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔

اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخ کے صفحوں میں گم ہو چکے ایسے کرداروں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے جو تاریخ کی ستم ظریفی اور کذب بیانی کے شکار ہیں۔ناول نگار نے جب چند اہم ترین انچھوئے گوشوں سے تاریکی کے دبیز اور بھاری بھرکم پردے ہٹائے تو وہ کردار اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے چمکنے لگے۔ایک ایسے نقاد کے لئے جس کا قلم دشت ہائے افسانہ کی سیاحی میں نووارد کی حیثیت رکھتا ہوا اس بے مثل مشاقی تحریر کا ثبوت پیش کرنا اپنے آپ میں ایک نادر روزگار ادبی واقعہ ہے۔بہر حال ’’سوار‘‘ کے مصنف کے لئے کئی چاند تھے سرِ آسماں کی تخلیق کوئی غیر متوقع کارنامہ نہیں کہا جائے گا۔کئی چاند تھے سرِ آسماں حیرت خانہ نگار عالم، نا قابل یقین حقائق وواقعات کا مجموعہ ہے۔چنانچہ اردو کے مشہور ناول نگار انتظار حسین نے بہت ہی جامع اور موزوں الفاظ میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

’’دلی کی مٹتی ہوئی بادشاہت کے سائے میں پھلنے پھولنے والی تہذیب کا منظر نامہ غالب ،ذوق ،داغ ،گھنشیام داس عاصی،امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خان وغیرہ بہت سے حقیقی کرداروں سے بھی جگمگا رہا ہے۔اس ناول کو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب میں قومی یکجہتی ،زندگی، محبت اور فن کی تلاش کی داستان کہیں تو بہتر ہے۔‘‘

نصف صدی کے بعد اردو میں کوئی ایسا ناول منظر عام پر آیا جسے بجا طور پر نوبل انعام کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔جن وجوہ کی

بناء پر یہ ناول نوبل انعام کا حق دار تصور کیا جا رہا ہے ان میں اہم ترین وجہ جزیات نگاری ہے، جس کے سہارے زبان وروایات اور دیگر رسم ورواج کے ساتھ ساتھ اپنے عہد اور گرد وپیش کے حالات و کوائف کو موثر طریقے سے افسانوی انداز بیان میں ہو بہو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جزیات کی پیش کش کرداروں کو دلچسپ و ناقابل فراموش بنانے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ اگر یہ خوبی اس ناول میں موجود نہیں ہوتی تو یہ ناول اتنی عظمت سے محروم رہ جاتا۔ مثال کے طور پر راجستھان کے کشن گڑھ کے دیہات میں آباد شبیہ سازی اور مصوری کے فن میں مہارت رکھنے والے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی زندگی کا تفصیلی ذکر 'تصویر' مخصوص اللہ 'اور بنی ٹھنی' کے باب میں موجود ہے۔ تصویر کے باب میں کشن گڑھ کے گاؤں ہندولی کے شبیہ سازوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔

''یہاں کے شبیہ سازوں نے جڑی بوٹیوں اور پتیوں اور درختوں کی چھالوں، پھولوں اور پھلوں اور بعض کیڑے مکوڑوں سے رنگ نکالنے کے طریقے اپنے اجداد سے سینہ بہ سینہ پائے تھے۔''

اسی طرح بنی ٹھنی کا تعارف کراتے ہوئے بنی ٹھنی کے باب میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

''کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلو سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک تھی کہ سر کا ایک ایک بال مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت، ہیرے گومید اور تامڑے صاف جھلکتے تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، منہ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق ....کانوں کی لؤوں کی سرخی اور خفیف سا کھنچاؤ تک دکھائی دیتا تھا۔ بلکہ محسوس ہوتا تھا۔''

قالین بافی کی پوری تفصیل تعلیم کے باب میں پیش کی گئی ہے۔ اس باب کو پڑھنے کے بعد کشمیر کے مفلوک الحال مسلمانوں کا منظر نظروں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

''یہ تعلیم کہلاتا ہے اٹھارہ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے قالین کا پورا نقشہ یہاں درج ہے۔ ایک ایک رنگ ایک دھاگا ان علامتوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنا ہی بہت مشکل ہے۔ چہ جائے کہ اس نقشے یعنی ایک نئی تعلیم خود ایجاد کرنا۔''

ولیم فریزر کے باب میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شعراء روساء شرفاء کی باہمی آمیزش سے تہذیبی تصادم و کشمکش کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ولیم فریزر کے لباس کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اورنگ آبادی ہمرو کا ایک بر کا تنگ پاجامہ، بدن پر باریک تنزیب کا کرتہ، اس پر سیاہ مخملی نیمہ، یعنی انگرکھا جس کی آستینیں نیچے سے کٹی ہوئی تھیں اس کے اوپر کچھ انگریزوں سی وضع کی عبا جس کے تکمے کھلے ہوئے اور آستینیں بہت چھوٹی تھیں۔ آٹھوں انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں، گلے میں سچے موتیوں کا ہار، پاؤں میں زری کے کام کی نکے دار جودھپوری جوتی ، سر پر سرخ سیاہ بوٹیوں کا ریشمی چیرہ بلدار، غرض ولیم فریزر بالکل دلی کا امیر زادہ لگتا تھا۔''

ایک باب میں دہلی کے مشہور نجومی اور قدیم ہندو تہذیبی وراثت کے امین پنڈت نند کشور کی شخصیت کی انتہائی باریکی سے عکاسی کی گئی ہے۔ پنڈت جی کی شخصیت اور سراپا کا اظہار کچھ یوں کیا گیا ہے۔

''پرانے طرز کی گھیر دار قبا البتہ رنگ سے عاری نہ تھی، کہ قبا تو رنگین ہی ہوتی تھی۔ لیکن پنڈت جی کی قبا اتنے ہلکے زرد رنگ کی ململ کی بنی ہوئی تھی کہ اس کے نیچے پاجامے کی سفیدی نے قبا کی زردی کو ڈھک لیا تھا۔ دہلوی انداز کا پاجامہ، سفید سنگی کا مہریاں نہایت فراخ کہ چلنے میں گھٹلی جوتی پائنچوں کے نیچے آجاتی............ان کی داڑھی لمبی گھنی اور سفید تھی۔ بائیں ہاتھ میں آبنوسی بیراگی، دائیں میں صندل کی ہزار دانہ تسبیح گلے میں سفید گلو بند جس کے نیچے سے رودراکش کے بہت بڑے بڑے کتھئی دانوں

کا مالا نظر آتا تھا۔ ان کے وجود کا سارا تاثر سفید نازک کپاس کے پھول جیسا تھا۔''

اسی طرح بھرمارو کے باب میں نوابوں اور زمینداروں کے اسلحہ خانہ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہے اس باب کے تحت اس عہد میں موجود مختلف النوع بندوقوں پر تفصیلی بحث قاری کی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنتی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں رائج درجنوں قسم کی بندوقوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ناول نگار کہتا ہے۔

''بھرمارو ایسی بندوق کو کہتے تھے جس میں بارود اور گولی نالی کی راہ سے بھری جاتی تھی۔ ایسی بندوقیں توڑے دار اور ٹوپی دار بھی کہلاتی تھیں۔ جدید توڑے دار اور قدیم توڑے دار بندوق میں فرق یہ تھا کہ قدیم توڑے دار بندوق کی بتی nipple کو رنجک دینے کے لئے شتابہ استعمال کرتے تھے جو ایک طرح کا فلیتہ ہوتا تھا۔''

ایک باب میں سونپور میلے کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں مہاکالی کا ذکر ہے جب کہ ایک اور باب میں ٹھگو کے ہتھیار کسّی کا ذکر کیا گیا ہے جو کم از کم اردو کے قاری کے لئے نیا موضوع ہے۔ ان نادر اور دلچسپ ابواب میں جزیات نگاری کے سہارے ان موضوعات کی عمیق گہرائیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں' لسانی اعتبار سے بھی بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں مستعمل زبان کے گوں نا گو پہلوؤں پر تفصیلی تجزیے کے لئے ایک مکمل باب کی ضرورت ہے۔ اس عہد میں اردو زبان تشکیل وتعمیر کے دور سے گزر رہی تھی روز بروز نئے نئے تجربات عمل میں آرہے تھے۔ ایسے میں لفظوں اور جملوں کے استعمال میں محقق و نقاد ناول نگار فاروقی نے پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ بقول انتظار حسین۔

''یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے جسے اول اول ہم نقاد و محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے۔''

مگر یہ انکشاف حیران کن ہے کیوں کہ انگریز حاکمان بہادر کی زبان، افواج و سپاہ کی زبان، امراء روساء کی زبان ، بادشاہوں کی زبان، شعراء وعوام الناس کی زبان کے استعمال میں واضح طور پر امتیاز قائم رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ہر ماحول اور ہر عہد میں الگ الگ زبان کا استعمال کرتے ہوئے ناول کو کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانا صرف اور صرف شمس الرحمٰن فاروقی کا حصّہ ہے۔ فاروقی کے مطابق۔

''میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مکالموں میں ، اور بیانیہ میں کسی قدیم کردار کی زبان، یا کسی قدیم کردار کے نقطہ نظر سے بیان کیا جا رہا ہے تو بیانیہ میں بھی کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جو اس زمانے میں مستعمل نہ تھا۔''

ناول میں مختلف مقامات کی نسبت سے جدا جدا محاورات و لفظیات کا استعمال کیا گیا ہے۔ بیگماتی زبان کے استعمال میں نسائیت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یہ ناول تاریخ، سماج، تہذیب و معاشرہ نیز اقتصادی و معاشی پہلوؤں پر گہری بصیرت افروزی کے علاوہ زبان و بیان اور فنی محاسن کے لئے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ناول کی انہیں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انتظار حسین لکھتے ہیں۔

''مدتوں بعد اردو میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو امراؤ جان ادا نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی۔''

855 صفحات پر مستعمل یہ ناول تقریباً سوا سو سال کے زمانے پر محیط ہے۔ ناول کا اختتام 1856 کے اواخر میں ہوتا ہے۔ ناول کی اصل کہانی ڈرامائیت اور طلسماتی ماحول میں

شروع ہوتی ہے۔کڑیوں سے کڑیاں ملانے کی کوشش میں 4 ابواب صرف کیئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی ماہر امراض چشم کی یادداشتوں کی بنأ پر ناول کے مرکزی نسوانی کردار وزیر خانم کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔اسی باب میں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک کی اولادوں سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔وزیر خانم کی بیٹی سوفیہ کی واحد نرینہ اولاد وسیم جعفر سے خلیل اصغر فاروقی کی ملاقات اتفاقیہ طور پر لندن کی برٹش لائبریری میں ہوتی ہے۔

وسیم جعفر صحیح معنوں میں نساب تھے۔وہ اپنے آبأ واجداد کی تلاش میں محو رہتے تھے۔ایک دن برٹش لائبریری کے تہہ خانے میں انہیں اپنی پردادی وزیر خانم کی شبیہ خیالی حاصل ہو جاتی ہے۔جسے ولی عہدِ سوئم مرزا غلام فخر الدین بہادر نے وزیر سے شادی سے قبل دلی کے مشہور نقاش میاں غلام علی خان سے بنوائی تھی۔اس تصویر کے سہارے وسیم جعفر کو وزیر خانم کی شخصیت اور سیرت کا تانا بانا تیار کرنے میں مدد ملتی ہے۔یہ دلچسپ امر ہے کہ تصویر ہو بہو 100 سال پرانی میاں مخصوص اللہ کی بنائی ہوئی بنی ٹھنی کی تصویر سے بھی حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے۔

لندن سے واپسی کے بعد خلیل اصغر فاروقی کو وسیم جعفر کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کا ترکہ بھی موصول ہوتا ہے جس میں سے ایک طلسماتی کتاب برامد ہوتی ہے جسے پڑھنے کی کوشش میں صدی کے عظیم ناول کی کہانی کی پرتیں خود بخود کھلنے لگتی ہے۔راجستھان کے کشن گنج کے گاؤں ہندل ولی کے معروف شبیہ ساز و مصور اور صوفی میاں مخصوص اللہ کے ذکر سے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔

''میاں مخصوص اللہ کا اصل نام مجھے نہیں معلوم۔نہ اس وقت ان کی عمر کا ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے..............اس وقت ان ک عمر کوئی تیس پینتیس رہی ہوگی لیکن دنیا سے بہت الگ تھلگ رہنے اور اپنے کھانے پینے لباس کی کچھ فکر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتے تھے اور سارا گاؤں انہیں میاں یا بابا کہتا تھا۔''

علاقے کے زمیندار مہاراول گجیندر پتی سنگھ کی بیٹی من موہنی سے میاں مخصوص اللہ کے تعلقات کب سے اور کس حد تک تھے یا دونوں کے تعلقات میں کتنی گہرائی و گیرائی تھی اسے واضح کرنے کی ضرورت شاید طوالت کی وجہ سے نہیں سمجھی گئی ہے۔بہر حال یہ ضرور ہے کہ اس تعلق کی بناء پر مہاراول نے اپنی بیٹی من موہنی کا قتل کر کے ہندل ولی گاؤں کے 200 نفری کو جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔گجیندر پتی کہتا ہے۔

''یہ لوگ صبح کے پہلے پہلے گاؤں خالی کر دیں،ورنہ میں ان کی جان مال کا ذمہ دار نہ ہوں گا۔''

ایک طویل مسافت کے بعد میاں مخصوص اللہ کشمیر کے پہلگام اور پھر بڈگام میں پہنچ کر پناہ گزیں ہوئے۔میاں کا بیٹا یحیٰی بڈگامی نے قالین بافی میں نام پیدا کیا۔یحیٰی بڈگامی کے دو بیٹے یعقوب اور داؤد بڈگامی کو نوجوانی میں اپنے اجداد کی جڑ کی تلاش کی خواہش نے انہیں دوبارہ کشن گڑھ کے سفر کے لئے مجبور کر دیا۔یعقوب اور داؤد اپنے دادا میاں مخصوص اللہ کے گاؤں ہندل ولی تو نہیں پہنچ سکے مگر ریواڑی اور جے پور کی شاہراہ پر ان کی ملاقات دو یتیم لڑکیوں سے ہوئی۔جن سے انہوں نے نکاح کر لیا اور مشرق کی جانب مختلف شہروں کی خاک اڑانے کے بعد انہوں نے فرخ آباد میں مستقل قیام اختیار کیا۔بعدہٗ دونوں بھائی لارڈ لیک کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔لارڈ لیک کی فوج کی منظر کشی جزیات نگاری کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

''فوج جب قیام کرتی تو گھڑی بھر میں بازار سج جاتا۔چشم زدن میں خیمے کھڑے ہو جاتے،قناطیں،راوٹیاں،اسپک،بے چوبے ان پر جھنڈیاں لہراتی ہوئی۔افسران اعلیٰ کے خیموں پر شمسے چمکتے ہوئے۔خیموں کے آگے بارگاہیں قائم ہوتی تھیں اور اگر میمیں ساتھ ہوں تو کوچہ سلامت بھی لگتا تھا........گوشت فروش

طعام فروش خاص کر پراٹھے کلچے اور کباب فروش تو تھے ہی ....دیسی بیوپاریوں میں مہاجن جوہری صراف مرصع کار ،سادہ کار، بزاز، کشمیری شال فروش ڈھاکے والے ململ فروش،اور پھر ارباب نشاط......گھوڑوں اور اونٹوں کے مرصع ساز، ہاتھیوں کی زرتار جھولیں، رنگی ہوئی مسکیں ...سارے لشکر بازار کو الف لیلیٰ سا منظر نہ کہئے تو اور کیا کہئے۔''

چند ہی سال بعد ایک معرکے میں ان کا پورا خاندان ہلاک ہو گیا اور صرف اس خانوادے کا یک کمسن بیٹا یوسف بچ رہا جس کی پرورش لارڈ لیک کی فوج کی ڈیرہ دار انی انوری بائی نے کی۔یوسف کے بڑے ہونے پر انوری بائی نے اپنی بیٹی اصغری کی شادی اس سے کر دی۔یوسف سادہ کار کی تیسری بیٹی حسینہء عالم وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم اصغری کے بطن سے 1811 میں پیدا ہوئی۔کئی چاند تھے سر آسماں کا مرکزی کردار وزیر خانم ناول کی جان ہے۔یہ ایک طرح دار کوش ادا اور کوش شکل عورت ہے۔ناول میں کئی مقامات پر فاروقی نے وزیر خانم کے حسن و جمال کا دلکش خاکہ کھینچا ہے۔وزیر کا باپ یوسف کہتا ہے کہ 10 سال کی عمر میں ہی وزیر کو اپنے حسن کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ نوکر چاکر ماں باپ کو وہ انگلیوں پر نچاتی تھی۔یوسف اپنی بیٹی کی نزاکت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

''روٹھتی تھی تو اس طرح کہ دیکھنے والوں کا کلیجے ٹکڑے ہوتے تھے کہ ہائے اس پھول سی نازک جان پر کس نے ستم کیئے۔منتی تھی تو یوں کھلکھلاتی تھی جیسے بلبل شاخسار شیراز میں برگ گل در منقار زم زمہ کناں ہے۔کپڑے جو بھی پہنا دیجئے اس پر یوں پھبتے تھے گویا خیاط ازل نے ساری قبائیں اس ے لئے قطع کی تھیں۔''

نواب شمس الدین احمد نے حویلی میں وزیر کی آمد کے وقت اس کے حسن کا جائزہ یوں لیا۔

''وزیر کی چال کچھ ایسی ہلکی ، لطافت سے بھرپور لیکن شہزادیوں والی تھی کہ لگتا تھا زمین اس کے آگے بچھی جا رہی ہو۔''

نواب اور وزیر کی ملاقات کے وقت ناول نگار نے وزیر کے سراپا کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''وزیر کی پتلی کمر، بھاری کولہے اور نمایاں گات اب اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ایسا لگتا تھا کولہوں کا وزن گات کو سنبھالے ہوئے ہے ورنہ یہ کامنی جیسی بیبیاں چلتیں تو پاؤں رکھتی کہیں اور پڑتا کہیں اور..........''

ایک اور جگہ وزیر کے جسمانی حسن کی تفصیلات یوں بیان کی گئی ہے۔

''رانیں گویا کمہار کے چاک سے اتار کر دھوپ میں سکھائی گئی ہوں،ایڑیوں اور تلوؤں کا گلابی پن پاؤں کے پنجوں اور تختوں کے ہلکے گلابی جامنی سانولے پن کی رونق بڑھا رہا تھا۔پیٹ بالکل مسطح گردن بالکل سیدھی اور سڈول،شربتی آنکھوں میں شمعوں کی جگمگاہٹ یوں تھی جیسے نازک بلوری قمقموں میں ارغوانی شراب بھر کر ان کے پیچھے قندیل روشن کر دی گئی ہو۔''

شمس الدین احمد نے ہم آغوشی کے دوران وزیر کے سراپا کو کچھ یوں محسوس کیا۔اس کی تفصیل نواب کے ذہن میں نشہ کی کیفیت پیدا کرنے والی تھی۔

''وزیر کا قد اوسط سے ذرا نکلتا ہوا تھا لیکن وہ ایسی بدن چور تھی کہ کپڑے پہن کر بالکل دھان پان لگتی تھی۔کپڑوں کے بغیر بھی وہ دبلی پتلی لیکن کامنی اور ولاسنی معلوم ہوتی تھی..........کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو متوازن، سڈول اور اپنے موقعے کے اعتبار سے بھاری باریک اور تنگ نہ ہو اور نزاکت میں کہیں تقصیر نہ تھی.........''

وزیر خانم صرف کئی چاند تھے سر آسماں کی ہی نہیں بلکہ اردو کے افسانوی ادب کے نمائندہ نسوانی کردار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرانے میں کامیاب ہوتی ہے ۔فاروقی کی صناعی نے وزیر خانم کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔وہ انار کلی کی طرح مظلوم ہو کر بھی

ناول کے کوائف وحالات کے رخ کو متحرک رکھتی ہے۔امراؤ جان ادا کی طرح وزیر خانم بھی شاعرہ ہے اور زہرہ تخلص کرتی ہے۔مگر وہ امراؤ جان کی طرح مردوں کے سامنے اپنی بے بسی ظاہر نہیں ہونے دیتی۔اسے حالات کا رخ اپنے قابو میں کر کے زندگی کا پتوار اپنے ڈھب سے چلانے کا گر بخوبی آتا ہے۔وزیر کے ارادے اس قدر مستحکم اور مضبوط ہیں کہ آگ کا دریا کی چمپا اس کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہے۔پریم چند کے نسوانی کردار تو وزیر کے سامنے کسی مقام پر نہیں ٹھہرتے۔میدان عمل کی مُنّی کی مدد کے لئے ہمدردوں اور معاونین کی ایک پوری فوج کھڑی رہتی ہے اس کے باوجود وہ گنگا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔گئو دان کی دھنیا زندگی بھر چیختی رہتی ہے مگر زندگی کے دھارے کو اپنے حق میں موڑنے میں ناکام رہتی ہے۔ان کرداروں میں وزیر کا انداز سب سے نرالا ہے۔اس کے فیصلوں میں تذبذب کا شائبہ تک نہیں وہ حالات کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے کسی سے ٹکرانے کی صلاحیت اور ہمت رکھتی ہے۔دہلی کا ریزیڈنٹ ولیم فریزر وزیر کو اپنے حرم میں داخل کرنے کا متمنی ہے۔مگر وزیر مضبوط لہجے میں کہتی ہے۔

''نواب ریزیڈنٹ بہادر، وہ راگ نہ چھیڑیں جن کے ساز آپ کے پاس نہ ہوں۔''

کہا گیا ہے کہ وزیر خانم جیسی عورتیں اپنی راہ خود متعین کرتی ہیں۔آزادی سے 100 سال قبل آزادیٔ نسواں کے متعلق وزیر کے خیالات موجودہ دور کے آزادیٔ نسواں کے نمائندوں سے کہیں زیادہ تابناک اور مستحکم ہیں۔شادی کے پیغام کو سرے سے خارج کرتے ہوئے وزیر کہتی ہے۔

''سنئے میں شادی وادی نہیں کروں گی''

وزیر کہتی ہے کہ میری صورت اچھی ہے میرا ذہن تیز ہے میرے ہاتھ پاؤں صحیح ہیں۔میں کس مرد سے کم ہوں۔حرام وحلال کے موضوع پر طویل بحث کے دوران وزیر اپنی بڑی بہن سے دو ٹوک لفظوں میں کہتی ہے۔

''بس دو بول پڑھ دینے سے جو حرام تھا وہ حلال ہو گیا؟اور آپ کی بیٹی ان قصائیوں کی چھری سے حلال ہو گئی تو کچھ نہ ہوا۔'' 22

وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم متخلص بہ زہراء کی ابتدائی دور کی غزلیں دہلی کی گلیوں میں موضوع بحث ہوا کرتی تھیں۔اردو کے مشہور شاعر اور استاد شاہ نصیر سے زہرہ اپنے کلام میں اصلاح لیا کرتی تھی۔ایک طویل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سن لیں ناصح کہ چپ رہیں بہتر
ہم نہ دیں گے جواب جاہل کو
بوسہ دیں گے نہ وہ تجھے زہرہ
منہ لگاتا ہے کون سائل کو

1830 میں وزیر خانم فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین احمد خان سے وابستہ تھی۔نواب بذات خود سخن سنج تھے۔تاریخ کی ان دونوں اہم ترین شخصیتوں کی یادگار اولاد اردو کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ تھے۔نواب مرزا داغ کی شاعری پر وزیر خانم کی شخصیت اور شاعری کا گہرا اثر تھا۔وزیر خانم نواب شمس الدین احمد سے قبل ایک انگریز مارسٹن بلیک کے ساتھ بھی رہ چکی تھی۔بلیک اور وزیر خانم کے تعلقات کے حوالے سے انگلو ہندوستانی تہذیبی کشمکش کو قریب سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مارسٹن بلیک کے ساتھ رہتے ہوئے وزیر نے تہذیبوں کے تصادم کا جو جائزہ لیا وہ یوں ہے۔

''مارسٹن بلیک کے خیال میں ہندوستان کے لوگ عموماً غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ تھے۔وہ یہاں کی ریت رسم کی کثرت پر ہنستا تھا......مارسٹن بلیک کے ہم قوموں کے دل میں ہند اور اہل ہند کی باتوں، ان کی معیشت و معاشرت، ان کے خیالات و عقائد، ان کے مذہب کسی چیز کی کچھ قدر نہ تھی......ایک تو یہ

صاحبان فرنگیان یہاں کی دولت بٹورنے آئے تھے اور دوسری بات یہ کہ اگر دولت بٹورنے کے لئے یہاں حکمرانی بھی کرنی پڑے تو وہ اس کے لئے بھی.....''

فاروقی نے انگریز افسروں کے روزمرہ کے معمولات کا ذکر بہت ہی سلیقے اور تفصیل سے کیا ہے۔

''آبدار خانے کے دوسرے سرے پر چھوٹا سا چبوترہ جس پر بڑے مٹکے یا ناند میں نہانے کے لئے پانی، خوشبو کے لئے کیوڑے کی بوتل، اور سر دھونے، بدن ملنے کے لئے حنا، بیسن وغیرہ کی پڑیاں رکھی ہوتیں۔''

وزیر خانم بہت دنوں تک مارسٹن بلیک کے ساتھ نہیں رہ پائی ۔یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان پر اپنی بالا دستی قائم کر رہا تھا۔انگریزوں کی مداخلت اور حکمرانی کے بڑھتے دباؤ کی وجہ سے عوام میں حیرت اور کہیں کہیں بے چینی اور ناراضگی کا بھی اظہار نمایاں طور پر ہو رہا تھا۔سوائی جے سنگھ کی وفات کے بعد اتالیق کی تعیناتی میں سیٹھ جھوٹا رام اور انگریز افسران کے مابین ہوئی جھڑپ کے بعد مشتعل ہجوم نے جھوٹا رام کی گرفتاری کے ذمہ دار بلیک کو محاصرے میں لیکر بے رحمی سے قتل کر دیا۔

''ایک گھڑی سے کم مدت میں بلیک کا بدن تلواروں سے چھلنی ہو گیا۔اس کا جسد خاکی اس کے قاتلوں نے اس کے رہوار پر ڈال کر گھوڑے کو میدان سے باہر نکال دیا۔''

بلیک کے قتل کے بعد وزیر جے پور سے دہلی چلی آئی جہاں اس کے حسن و جمال کے چرچے دوبارہ عام ہونے لگے۔

''وہ غنچہ نیم شگفتہ ہزاروں پھولوں کی بہار اور ہزاروں بہاروں کا پھول بن کر خارستان راجستھان سے چل کر دلی کے چمنستان عیش کو دوبارہ معطر اور آتشستان ہجر کو دوبارہ روشن کرنے چلا آیا۔''

دلی واپسی کے بعد وزیر کسی مرد کی خواہش مند تھی۔اسے ایک ایسے ساتھی کی تلاش تھی جو زندگی کی کشتی کا پتوار کھینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

''مردوں کے ساتھ وہ اپنی شرطوں پر معاملات ضرور کر سکتی تھی۔یا اگر اپنی شرطوں کو سراسر نہیں تو کم سے کم کچھ اہم شرائط منظور کرائے بغیر وہ کسی کی پابند ہونا تو کیا کسی سے متوسل ہونے پر بھی تیار نہ تھی۔''

رام پور کے نواب یوسف علی خان کے توسط سے دہلی کا موجودہ ریزیڈنٹ ولیم فریزر وزیر خانم کو دعوت پر مدعو کرتا ہے جہاں وزیر کی ملاقات شمس الدین احمد خان والی فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے ہوتی ہے۔

''ادھر شمس الدین نے جو ذرا توجہ سے وزیر خانم کی طرف دیکھا تو انہوں نے بھی کسی نہ کسی قرینے سے یہ بات سمجھ لی کہ وزیر خانم اور ان کے درمیان کہیں کوئی شعلہ روشن ہونے لگا ہے۔''

ناول نگار نے وزیر خانم اور نواب شمس الدین احمد خان کی وابستگی پر تقریباً 300 صفحات صرف کیا ہے۔یہ حصے ناول کے بہترین صفحات میں شمار کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اس سے ہندوستان کے زوال پذیر دور کو سمجھنے میں بھرپور مدد ملتی ہے۔ولیم فریزر وزیر خانم کو اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتا تھا۔مگر وزیر خانم نے شمس الدین احمد خان کو ترجیح دیا۔اس نے ولیم فریزر اور شمس الدین احمد دونوں کی پیش رفت پر گہرائی سے غور کیا اس نے مارٹن بلیک کے ساتھ بغیر نکاح کے رہنے کو بھی جواز فراہم کیا۔وہ کسی انگریز نابکار کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی ولیم فریزر کے متوقع تجویز پر خود کلامی کے انداز میں وزیر خانم فیصلہ کرتی ہے۔کسی انگریز نابکار سے رشتہ جوڑنا توبہ توبہ میں کوئی ڈومنی ہوں۔بلاک صاحب کی بات کچھ اور تھی۔

''اگر فریزر صاحب مجھے۔۔۔مگر مجھے۔۔کیا ان کی نوکر بن کر رہنا منظور ہوگا؟ مانٹن بلاک صاحب کی بات اور تھی''

خودکلامی کے انداز میں سوچتے ہوئے وزیر کہتی ہے۔

"مجھے کسی موئے مشٹنڈے انگریز کے حرم میں پڑے سڑتے رہنا منظور نہیں بلا سے وہ فارسی ہی بولتا ہو۔"

وزیر نواب سے نکاح کی خواہش مند تھی مگر اس نے نکاح پر بہت زور نہیں دیا اور اس وابستگی کو ہی اپنے دین وایمان کی سلامتی سے تعبیر کرتی تھی۔ نواب اور وزیر کے باہمی تعلق سے ولیم فریزر رقابت کی آگ میں جلنے لگا۔ چنانچہ نواب سے فریزر کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ عام ملاقاتوں میں دونوں کے درمیان فقرے بازی اور

کردار کشی کے واقعات وقوع پذیر ہونے لگے تھے۔ ولیم فریزر نے نواب سے اس مخاصمت کی بنا پر لوہارو کی ریاست نواب سے واپس لیکر ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں میں تقسیم

کرنے کی شفارس گورنر جنرل سے کردی۔ اسی دوران ایک رات کسی سیاہ پوش سوار نے فریزر کو پہاڑی واقع اس کی حویلی کے نزدیک گولیوں سے بھون دیا۔ فریزر موقعہ واردات پر ہلاک ہوگیا۔

"پہلی ہی گولی نے اس کا کام تمام کردیا تھا۔"

اغلب ہے کہ سیاہ پوش نامعلوم شخص نواب کا میر شکار بھر مارو محمد کریم خان رہا ہو۔ نواب تو دہلی سے 6 دن کے فاصلے پر ریاست فیروز پور جھرکہ میں گزشتہ تین ماہ سے قیام پذیر تھے۔ شہر میں افواہیں گشت کر رہی تھیں جن میں فریزر اور نواب کے مخاصمانہ تعلقات کی بنا پر نواب کو بھی فریزر کے قتل کا ذمہ دار بنایا جا رہا تھا۔

"نواب شمس الدین احمد نے لوہارو کے چھین جانے کا ذمہ دار فریزر کو ٹھہراتے ہوئے اور جہانگیرہ بیگم کے بارے میں اسنے جو نازیبا بات کی تھی اس کے بدلے میں فریزر کو مروادیا۔"

انگریز حاکمان قتل کے پیچھے سیاسی پہلو کی تلاش میں سرگرداں مگر شہر میں اڑ رہی افواہوں پر بھی غور کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے تفتیش کی سوئی نواب کی طرف گھومنے لگی۔ مرزا غالب کے ساتھ تعزیت کے لئے آئے مرزا فتح اللہ بیگ فریزر کی لاش پر گر کر بے ہوش ہوگئے اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا......"

مرزا فتح اللہ بیگ اور شمس الدین احمد خان رشتے میں بھائی تھے۔ دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی مگر کسی بات پر دونوں میں نا اتفاقی پیدا ہوگئی چنانچہ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ غالب تو نواب شمس الدین احمد خان کے بہنوئی ہی تھے۔ ریاست فیروز پور جھرکہ کی پنشن کی تقسیم سے غالب شمس الدین احمد سے نالاں رہتے تھے۔ قتل کے اس پورے معاملے میں غالب غیر جانبدار تھے مگر جا بجا انہوں نے نواب سے اپنی نفرت کا اظہار ضرور کیا۔ مرزا غالب نے ولیم فریزر کی موت پر جو مرثیہ لکھا تھا جس کا مقطع یوں ہے۔

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزر ے
زیں ساں زچیرہ دستی اعدا شود ہلاک

مرزا فتح اللہ بیگ اور مرزا غالب کے بعد دہلی کے شاعر گھنشیام لال عاصی نے بھی فریزر کے قتل کی تاریخ کہی تھی۔ اس نظم میں عاصی نے طرح طرح کے ہنر دکھائے تھے۔

گفت ہاتف ز روے درد والم
آہ خون فر یز ر و لیم

چارلس مٹکاف نے نواب سے ذاتی دشمنی کے باعث ان لوگوں کی بہتان تراشی کو ناقابل توجہ تصور کیا۔ مگر تفتیش کر رہے پانی پت کے مجسٹریٹ جان لارنس اور فریزر کے چھوٹے بھائی سائمن فریزر کا شک نواب پر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن ان لوگوں نے مٹکاف سے اجازت لیکر دریا گنج واقع نواب کی حویلی پر رات میں چھاپہ مارا۔ نواب کے اسطبل میں بندھا ہوا گھوڑا شک کے

دائرے میں آگیا جس کے پیر میں الٹی نال ٹھکی ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بعد پے در پے نواب مشکوک ہوتے چلے گئے۔ بھر مارو کریم خان گرفتار ہوگیا۔ تفتیش کے دوران کریم خان نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔ ایک دوسرا نوکر انیا میواتی جو قتل کا چشم دید تھا۔ انگریزوں کے سامنے حاضر ہوکر کہا کہ بھر مارو کریم خان نے مجھے گولی چلنے کی اطلاع نواب تک پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ انہیں نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر نواب کو ولیم فریزر کے قتل کے جرم میں شریک ہونے کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے پھانسی کا حکم صادر کیا گیا۔ اس وقت نواب مرزا داغ صرف پانچ سال کے تھے۔ نواب کی پھانسی کے دوران انگریز حاکمان نے کسی طرح کی شورش سے نبٹنے کے لئے پوری تیاری کر رکھی تھی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

"دیسی اور گورا پلٹنوں کی کثیر تعداد کے باوجود فساد کا پھر بھی اندیشہ تھا۔"

انگریزوں کا خوف بجا تھا۔ سیاسی اعتبار سے دہلی کے عوام پر اس قدر شکستگی طاری تھی کہ ان میں انگریزوں کے خلاف کسی طرح کی آواز اٹھانے کی سکت باقی نہیں تھی۔ پھانسی کے وقت لوگوں کی بھیڑ بہت کم تھی۔ زیادہ مجمع سرکاری عملہ فعلا کا تھا۔ تاریخ میں شمس الدین احمد کی پھانسی کی کہانیاں کئی زاویہ سے سنائی جاتی ہیں۔ ناول نگار اور محقق شمس الرحمن فاروقی نے قتل کے اصل وجوہ اور نواب کی پھانسی پر پڑے آہنی پردے کو اٹھا کر تاریخ کے صفحات پر گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس حادثے کے بعد وزیر پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے سامنے نواب مرزا داغ کی بہتر تعلیم وتربیت کا خیال مقدم تھا۔ آئے دن نواب کے ورثا کو بھی راستے سے ہٹانے کی خبریں دہلی میں گشت کر رہی تھیں جس سے وزیر بے حد فکر مند ہوئی۔

"کمپنی بہادر کے عہدے داران بالا وحکمان اعلی نے فیصلہ کیا ہے کہ شمس الدین احمد کے اعقاب میں کوئی ایسا باقی نہ رکھا جائے جو آئندہ ان کی ریاست کا دعویدار ہو سکے یا ان کی سزا کے لئے کچھ تاوان طلب کرے۔"

وزیر خانم ان وثوقوں کے پیش نظر دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس نے داغ کو رام پور بھیج دیا۔ پھر خود بھی چلی گئی۔ رام پور کے شاعرانہ ماحول اور شاعرہ ماں کی تربیت میں داغ نے بچپن میں ہی شعر کہنے شروع کردئے۔ وزیر خانم نے ہی نواب مرزا کے لئے دیوان درد سے فال نکال کر داغ تخلص تجویز کیا۔ یہ تخلص بعد میں بہت مقبول ہوا۔ اسی دوران نواب رام پور کے داروغہ فیل خرگاہ آغا مرزا تراب علی کی طرف سے وزیر کو نکاح کا پیغام موصول ہوا۔ پوری طرح زندگی سے مایوس اور گوشہ نشینی اختیار کرچکی وزیر کے جذبات خفتہ اور مردہ جسم میں حرارت پیدا ہوگئی وہ ایک بار پھر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وزیر کہتی ہے۔

"محبت کی تلاش میں سرگرداں پھرنا ہی شاید ہمارا مقدر ہے۔"

آغا مرزا تراب علی خود بھی شاعر ہیں۔ ان کی صحبت میں وزیر کی شعری حس دوبارہ بیدار ہوتی ہے۔ ایک دن سراج اورنگ آبادی کی ایک غزل "ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو" پر گرہ لگانے کے لئے آغا تراب علی نے وزیر کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ آغا تراب علی اور وزیر کی گفتگو ادبی ذوق کا بہترین نمونہ ہے۔

"اے چلئے آغا صاحب۔ وزیر کبھی کبھی تنک کر جواب دیتی ہمیں اپنی کھال میں مست رہنے دیجئے کہیں آپ کا وہی حال نہ ہو کہ لوگ کہیں لیتر کے گھر میں تیتر باہر رکھیں ہ بھیتر۔"

میرا منہ چڑاتا رہتا ہے۔"

•••

اردو غزل میں تصورِ عشق

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن

پرنسپل: ایس۔ کے۔ اے۔ ایچ ملت کالج

داونگرے۔577001 (کرناٹک)

سیل:0944920221

غزل اردو زبان کی مشہور و معروف صنفِ شاعری ہی نہیں بلکہ اسے سرتاج الشاعری کہا جاسکتا ہے۔ جسے رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری غزل کے آغاز، مزاج اور تاریخی ارتقاء کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''غزل کے معنی ہیں عشق اور جوانی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن وعشق، اخلاق وتصوف وغیرہ مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد میں غزل بھی شامل تھی یعنی قصیدوں کی تمہید میں عاشقانہ مضامین لکھتے تھے اور اس کو غزل یا تغزل کہتے تھے لیکن یہ تمہید مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس ٹکڑے کو غزل کے نام سے مستقل صنفِ شاعری بنالیا۔''

اردو غزل کے آغاز اور ابتدا کے متعلق متعدد آرا پائی جاتی ہیں۔ اس صنف کی ابتدا کب اور کہاں پیدا ہوئی۔ اس کا تشفی بخش جواب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون ''شعر وغزل'' میں لکھتے ہیں۔

''غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر ایک گہری معنویت رکھتا ہے۔ نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کی قید میں تھی، بالکل اسی طرح جیسے کسی داستان کی نرم ونازک شہزادی کسی ہیبت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہو۔ مگر ایک روز قصیدے کے ڈھانچے سے منحرف ہوگئی اور اس نے کسی بادشاہ یا امیر وزیر کو چھوڑ کر ایک نرم ونازک محبوب کو اپنا لیا اور پھر اپنے محبوب کی تعریف میں رطب اللسان ہوئی اور پھر معاملہ بندی کے میدان میں غلو کی حد تک پیش قدمی کرتی چلی گئی۔''

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس صنف کو غزل کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ حسن وعشق ہی اس کا اصل موضوع ہوتا تھا۔ غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا کے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔

''غزل کے معنی عورت یا محبوب کی باتیں کرنے کے ہیں۔'' (اردو شاعری کا فنی ارتقاء مجنوں گورکھپوری ص 60)

زمانے کے ساتھ ساتھ وقت کی ضروریات اور حالات کے پیشِ نظر اس کے موضوعات میں تنوع اور وسعت پیدا ہوتی گئی اور آج غزل میں ہر طرح کے مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر مضامینِ حسن وعشق کو مرکزیت اور اولیت حاصل ہے۔ ابتدا سے ہی حسن وعشق کی جلوہ ریزیاں اور جلوہ سامانیاں پورے آب وتاب کے ساتھ اس میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غزل کا سنگِ بنیاد عشق پر رکھا ہوا ملے گا۔ اگر حسن وعشق کے پر کیف اور پر مسرت بیان کو اس سے نکال دیں تو یہ بے جان، بے کیف اور بے مزہ ہوجائے۔ بقول ڈاکٹر سید محمد حسین۔

''غزل در حقیقت عشق کی آئینہ دار ہوتی ہے کسی بوالہوس کی داستان نہیں۔ مطربِ حسن ہے۔ شاعر کے اپنے تصورات و وارداتِ قلبی کی پر خلوص عکاسی ہے اور آبروئے سخن بھی۔'' (اردو میں عشقیہ شاعری از ڈاکٹر سید محمد حسین ص60)

ہر دور میں دنیا کی تمام زبانوں کے شعری سرمایہ میں عشقیہ ادب ہی شہرت اور مقبولیت کا حامل رہا ہے حسن وعشق کا موضوع دراصل فارسی اور اردو ادب کی روح ہے۔ فارسی کی طرح اردو شعرا بھی عشق کو سطحیت سے بلند تر دیکھتے ہیں وہ اسے کامل، متحرک جذبہ اور قوت عمل گردانتے ہیں۔ کبھی عشق سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہیں بھی تو وہ ذہنی طور پر تصورِ عشق کی روایت سے انحراف نہیں کرپاتے۔ لہٰذا فارسی شعرا کی طرح اردو شعرا بھی اظہارِ عشق کے لئے عموماً ساقی، بادہ وساغر اور مے کدہ کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اس کے بغیر تشنگی محسوس کرتے ہیں جیسا کہ غالب کا خیال ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بقول فراق گورکھپوری۔ ''زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق ومسائل غزل کے موضوع ہوتے ہیں ان حقائق میں وارداتِ عشق کو اولیت حاصل ہے کیونکہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں جنسیت اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے''۔ (مضمون غزل کی ماہیت مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقا ص19)

اردو غزل کا ہر ایک شاعر عشق کے متعلق اپنا نجی تصور نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ کسی طرح تصورِ عشق کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے ۔اس کے باوجود وہ رسمی طور پر حسن وعشق کا ذکر اپنی غزلوں میں کرتا ہے۔ اس طرح عشق کا براہِ راست تجربہ ہر شاعر کے یہاں پوری آب وتاب کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ عشقیہ بیان ہوتا ہے۔ جیسا کہ سراج اورنگ آبادی، میر، درد، غالب، مومن، امیر مینائی، اقبال، حسرت، جگر، فراق اور فیض وغیرہ کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اب یہ عشق کیا ہے اور اس کے اقسام کیا ہیں تو اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہوسکتا ہے کہ عشق دو قسم کا ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی۔ عشقِ حقیقی سے مراد محبتِ خداوندی اور عشقِ مجازی سے مراد ظاہری عشق ہے۔ عشقِ مجازی کسی حسن مجسم کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اگر جسموں کی چاہت نہ ہو بلکہ اس سے بلند و بالا جذبہ کارفرما ہو تو وہ عشقِ حقیقی کے قریب تر ہو جاتا ہے اور اگر کسی مجسم کو دیکھنے سے نفسانی تحریک اجاگر ہو تو وہ ''عشقِ حیوانی'' کہلاتا ہے۔

عشق ایک کیفیت یا جذبہ کا نام ہے جو کسی کے دل میں کسی دوسرے شخص کے لئے پیدا ہوتا ہے جسے پیار، محبت، چاہت، پریت، پریم اور انگریزی میں Erotic Love کہتے ہیں یہ تمام جذبات جب شدت اختیار کرجاتے ہیں تو عشق کے حدود میں داخل ہوجاتے ہیں۔ غزل میں شاعر عشق کو کبھی آگ کا دریا کہتا ہے تو کبھی جان کا روگ اور کبھی بلائے جان، کبھی عبادت کا درجہ دیتا ہے تو کبھی اپنے محبوب کے عشق میں کھوجانے کو حاصلِ زیست سمجھتا ہے۔ عشق کا جذبہ حد سے گذر جاتا ہے تو اپنے محبوب کی خاکِ پا کو بوسہ دیتے ہوئے اس کے نقشِ قدم پر سجدہ ریز ہوجاتا ہے اور کبھی عشق میں اس طرح ڈوب جاتا ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سوائے عشق کے وہ اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق
جان کا روگ ہے بلا ہے عشق

عشق ہی بے شک عبد ہے حسن ہی معبود ہے
اس کے ہی زیر وزبر سے یہ جہاں سارا ہوا

اردو شاعری میں جو عشق کا تصور ملتا ہے وہ دو دروازوں سے داخل ہوا ہے مگر ہمارے یہاں عشق کے تین مکاتیب فکر ملتے ہیں۔ اسلامی مکتبہ فکر، ایرانی مکتبہ فکر اور ہندوی مکتبہ فکر۔ لہٰذا اردو غزل میں یہ تینوں مکاتیب عشق کے پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اردو غزل کی روایت میں تصورِ عشق دو اہم دروازوں سے داخل ہوا جس کا ایک دروازہ سر زمین ہند سے کھلتا ہے اس لئے ابتدائی غزلوں میں ہندوی عشق کا کافی

بول بالا دکھائی دیتا ہے۔اس کا رنگ روپ خالص ہندوستانی ہے جو سماجی اور ثقافتی انداز لئے ہوئے ہے جس میں رادھا کرشن،اجنتا اور ایلورا کی عشقیہ داستانوں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔دوسرا دروازہ فارسی ادب کی جانب سے کھلتا ہے جس کی بدولت ہمارے شعرا فارسی شعرا کے کلام سے متاثر ہوئے اور اپنی غزلوں میں شیریں فرہاد،لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا کی عشقیہ داستانوں کے پیشِ نظر گل وبلبل کی حکایتوں کو اجاگر کرتے رہے۔علاوہ ازیں اسلامی طرزِ فکر اور عشقِ حقیقی کا تصور بھی ان کے پیشِ نظر آیا۔

اردو غزل میں عشق کا جو تصور ہے وہ صوفیائے کرام کے نظریات کا جزو ہے۔حقیقی عشق کو غزلوں میں برتنے کا اہم مقصد تصوفانہ نظریات کو پیش کرنا ہے اور اس کے ذریعہ معرفتِ الٰہی سے انسانوں کو آشنا کرنا ہے یہی صوفیائے کرام کا وژن اور مشن تھا۔اسی لئے صوفی شعرا نے خاص طور سے غزل کو اپنایا،اسے وسعت دی اور اس میں فلسفیانہ افکار و خیالات سموتے گئے۔

ہمارے صوفی شعرا میں مجازی عشق کا خاص رجحان پایا جاتا ہے۔امیر خسرو،ولی،سراج،مظہر جان جاناں،شاہ حاتم،میر درد،میر تقی میر وغیرہ عشقِ مجازی کے پردے میں عشقِ حقیقی بیان کرتے ہوئے ذاتِ حقیقی کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔میر درد اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ بغیر عشق کے کسی شئے کا تصور کرتے ہیں اور نہ ہی کسی ذات کو عشق سے الگ تصور کرتے ہیں۔عشقِ حقیقی میں عموماً بندہ عاشق اور اللہ تعالیٰ معشوق ہوتا ہے۔جدائی کی تڑپ اور وصل کی تمنا عاشق کے دل میں ہر لحظہ پائی جاتی ہے وہ اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ

وصل حسن وعشق سے جب نور اک افشا ہوا
ایک ہی جلوہ کہیں مجنوں کہیں لیلیٰ ہوا

سرقاضی سید قمرالدین قمر

سراج کا عشق انہیں جنوں کی حد تک لے گیا اسرار و معرفت کی راہیں ان پر روشن ہوئیں۔ان کا عشق آتش گیر تھا شدتِ عشق میں تپ کر سراج نے شاعری کو ایک ایسا رنگ و بو بخشا جس کی مہک آج بھی ہر طرف موجود ہے مثلاً

بھڑکے ہیں میرے دل میں برہ آگ کے شعلے
وہ جانِ سراج آ کے بجھا دے تو بجھا ہے
جل گیا معشوق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

سراج اورنگ آبادی

میر درد بھی عشق حقیقی کی آگ میں تپ کر کندن بن گئے اور انہوں نے عشق کا ایک منظم تصور پیش کیا۔ان کے یہاں عشق میں ایک سوز و گداز پایا جاتا تھا۔برہ کی آگ میں تڑپنے کی کیفیت موجود ہے۔ان کے عشق حقیقی کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں،اک تو ہی صاحبِ خانہ تھا
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہماری غزلیہ شاعری میں عشق مجازی کا جو تصور ملتا ہے اس میں ایک طرف عاشق،معشوق اور رقیب کا مثلث ہے تو دوسری طرف اس میں وصل،فراق اور انتظار کے ثلاثی زاویئے بھی ملتے ہیں۔محبوب کی موجودگی باعثِ مسرت اور عدم موجودگی آرزوؤں،تمناؤں اور خواہشوں کو جگاتی ہے۔وصلِ محبوب سے قبل عاشق کا دل لذت عشق کی کیفیت اور امید و بیم،حسرت و یاس اور دل شکستگی کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔محبوب کا لطف و کرم حاصل ہونے کے بعد بھی اس کے ذہن میں فرقت کا خوف رہتا ہے۔وہ معشوق کی بے وفائی اور طرزِ تغافل سے خوف زدہ رہتا ہے۔

یاس ہی یاس گرد ہے دل کے
اب کوئی آس پاس نہیں

میر حسن

کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا
مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

امیر مینائی

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میر

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
سو التفات کم ہے دل آزاریاں بہت

میر

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب

اردو غزل میں جو تصورِ عشق ہے اس میں مسرت و انبساط سے زیادہ رنج و الم اور درد و کرب پایا جاتا ہے۔عاشق عموماً حسرت و یاس اور حزن و ملال کا شکار،رنجیدہ اور آزردہ پریشان حال اور چاک دامن ہوتا ہے مگر حرفِ شکایت معشوق کے خلاف لانے سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔اس عشق کے کھیل میں روٹھنا معشوق کی شان تو منانا عاشق کی آن ہے۔عاشق کے حصہ میں درد و کرب کی کسک اور فراق کی تڑپ ہوتی ہے لہذا اس محبت میں خوشی کم اور غم زیادہ ہے بالفاظِ دیگر محبت میں خوشی اور غم کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔

اردو غزل میں معشوق کو مرکز باندھنے کا رواج عام ہے جو عربوں سے فارسی میں آیا اور فارسی سے اردو میں۔پہلی صدی عیسوی میں ایران پر جب عربوں کا غلبہ ہوا تو فوج میں ترک نوجوان سپاہی کے طور پر بھرتی کئے جانے لگے جو عموماً خوبصورت،حسین اور جمیل ہوتے اور معشوقانہ صفات رکھتے تھے۔اعلیٰ افسران کے ساتھ رزم اور بزم،خلوت وجلوت میں وہی رہتے تھے۔جس کا اثر یہ ہوا کہ معشوق کا سراپا بیان کرتے وقت ترک سپاہیوں اور آلاتِ جنگ کو خاص طور پر ذہن میں رکھا جانے لگا۔یہ وہ دور تھا جب کہ فارسی میں شاعری کی شروعات ہو رہی تھی لہذا فارسی شعرا بھی معشوق کے لئے ''ترک'' استعمال کرنے لگے اور معشوق کے لئے تشبیہات و استعارات آلاتِ جنگ سے متعلق پیش کرنے لگے۔شبلی نعمانی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''......خیالات پر اس کا اثر یہ ہوا کہ عشقیہ شاعری پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔معشوق کے اوصاف اور سراپا کی تشبیہات اور استعارات میں تمام تر فوجی سامان ہے۔یہاں تک کہ حسن کا مرقع میدانِ جنگ نظر آتا ہے......زلفیں کمند ہیں،ابرو خنجر،پلکیں تیر،آنکھیں قاتل وغیرہ وغیرہ......ان خیالات نے رفتہ رفتہ یہ وسعت حاصل کی کہ غزل کا بڑا حصہ سامانِ جنگ اور قتل وخون کے لوازمات ہیں۔''(شعرالعجم مولانا شبلی جلد چہارم ص197-198)مولانا شبلی کے مذکورہ اقتباس کو ذہن میں رکھ کر درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بھواں تیغ،پلک خنجر،نگاہ تیر
ہے کس کے قتل کا ساماں ہوا ہے

ولی اورنگ آبادی

بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

غرض یہ کہ ہماری عشقیہ شاعری میں خنجر،تلوار،بھالا،برچھی،تیر،نشتر اور انی،نوک کے علاوہ مقتل،خونِ ناحق،زنداں وقفس اور صلیب ودار وغیرہ لوازمات در آئے ہیں۔

دکن میں یوں تو مثنوی کو عروج حاصل رہا،لیکن غزل کا رجحان بھی بڑھتا رہا۔عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار میں غزل کو صرف عورتوں سے باتیں کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا

رہا۔اس کے ذریعے معشوق کی ہر ایک ادا اور اس کے خدوخال بیان کئے جاتے رہے اور حسن وعشق کا کھل کر اظہار کیا جانے لگا۔اس طرح خالص غزل کے نقش ونگار حسن شوقی کے یہاں ابھرتے ہیں وہ اس روایت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے بانی گولکنڈہ کے محمود، خیالی، فیروز اور قلی قطب شاہ ہیں۔شاہی ونصرتی کی غزلوں میں لذتِ جسم اور عشق کا جنسی پہلو کھل کر ظاہر ہوتا ہے۔ ہاشمی نے غزل میں عورت کے جذبات کو عورت کی زبان میں اور عورت کے انداز میں بیان کیا ہے جو ہندی شاعری کا طریقہ کار ہے۔

اردو کی ابتدائی غزلوں میں محبوب کے حسن کی تعریف اور سراپا نگاری میں فطری حسن پایا جاتا ہے۔ان شعرا کا معشوق ''عورت'' ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ عورت ہی کے تصور میں کہا ہے۔یہ انداز ولی کے دور تک دیکھا جاسکتا ہے۔ولی کے یہاں عشق فرحتِ حیات اور نشاطِ روح ہے۔ولی کا ایمان بھی عشق پر ہے۔فارسی کی تقلید کرتے ہوئے ولی نے اپنے محبوب کو کافر ایمان، بت کافر، دشمنِ ایمان وجاں وغیرہ جیسے القاب وخطابات سے نوازا۔ان کے یہاں حزن وملال کم ہے وہ نشاط انگیز ڈھنگ میں معشوق کے حسن اور وارداتِ عشق کو بیان کرتے ہیں۔ولی اور دیگر شعرا کا اس زمانے میں عورت کے تصور میں غزلیں کہنے کا انداز دیکھئے۔

تجھ گال کی سرخی انگیں یاقوت رومانی کدھر
تجھ اشک کے لالے انگیں لال بدخشانی کدھر

ولی

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوضِ کوثر پہ جوں کھڑا ہے بلال

ولی

تجھ زلف کے رین میں جھمکے برنگ عذر
کوئی چاند کوئی زہرا کوئی مشتری کہتے ہیں
جانا تجھے جو دیک کر بہو چھند بھرکتے ہیں
کوئی حور کوئی پدمنی کوئی شہ پری کہتے ہیں

حسن شوقی

زمانے کی تیز رفتاری اور بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر غزلیات میں نئے نئے موضوعات پیش کئے جانے لگے۔غزل کی تنگ دامنی کا احساس غالب کو شدت سے ہوا۔چونکہ غالب کے دور تک اردو غزل کا دائرہ حسن وعشق کی کیفیت، ہجر ووصال کے بیان اور گل وبلبل کی داستان اور چاک گریباں کے قصوں تک محدود تھا۔غالب نے غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کو اردو غزل میں جگہ دی اور کہا۔

سنبھلنے دے مجھے اے نامرادی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غالب کے یہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی آمیزش ہے۔عشق ان کے یہاں ایک مکمل وجدان ہے۔ان کے عشق میں ایک اضطرابی کیفیت ہے جس کی سوز وتپش سے دل پگھل جاتے ہیں۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب سے پہلے میر تقی میر نے غزل کو آسمانِ ادب پر پہنچا دیا تھا۔میر اپنے والد کی اس بات کے قائل تھے کہ ''بیٹا عشق کرو عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے......بغیر عشق زندگی وبال ہے۔'' لہذا میر نے عشق کو اعلیٰ وارفع سمجھا۔میر فطری طور پر عاشق مزاج تھے۔ڈاکٹر خوشحال زیدی میر کے تصور حسن وعشق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ایک طرف ہمیں میر کا دل گداختہ نظر آتا ہے۔دوسری

طرف ان کے جذبات اور محبت کے درمیان تصادم۔تیسری طرف اخلاقی اور جذباتی کی آزادی کے درمیانی فاصلوں کو طے کرنے کی کوشش۔میر شکستِ محبت کے شاعر ہیں۔''

الغرض میر کے یہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی کے دونوں رنگ ہیں۔میر کی توجہ کا مرکز حسن رہا ہے۔ان کے یہاں عشق کا انداز دیکھئے۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن
مرضِ عشق کا علاج نہیں

یہ وہ دور ہے جب دلی اجڑتی اور بستی رہی۔اس کا بار بار استحصال ہوتا رہا۔اس دور میں دو اہم دبستانوں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کا وجود ہوا۔دبستانِ دہلی کے شعرا تصوف کے قائل ہوکر فلسفۂ وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین غزلوں میں سموتے گئے۔ان کے یہاں عشق وعاشقی کا بیان بھی خوب ہوتا رہا لیکن ان کے کلام میں پاکیزہ خیالات وجذبات ہمیشہ کارفرما رہے۔وصل سے زیادہ ہجر کی لذت تھی اور محبوب قابلِ احترام تھا۔اس عہد میں محبت کا نہایت بلند اور پاکیزہ تخیل پیش کیا گیا۔

مرے سلیقے سے مری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس کے برعکس اہلِ لکھنو فارغ البالی کی وجہ سے عیش وعشرت کے دلدادہ تھے ان کے یہاں عیش کے دیگر لوازمات کے علاوہ طوائفوں کی کثرت تھی حسن کی جلوہ آرائیاں عام تھیں اور حسن بے نقاب تھا شعرائے لکھنو اپنی غزلیات میں عورت کے حسن کو کھل کر بیان کرنے لگے۔اس کے زیورات اور ملبوسات کا مسّی ،کاجل، زلفوں ،گیسوؤں، ابروؤں، پلکوں ،لبوں، رخساروں یہاں تک کہ کمروں اور چوٹیوں کا تذکرہ کھل کر کیا جانے لگا۔جس کی بدولت غزلوں میں سطحیت تو ضرور پیدا ہوگئی لیکن اردو غزل جو اب تک نسوانی کردار سے کسی حد تک محروم تھی اس میں صنفِ نازک کے بدن، خدوخال نمایاں ہونے لگے۔تعیش کا رنگ شاعری کی روح بن گیا۔شوخیانہ معاملات وجذبات کا اظہار بھی نمایاں ہوگیا۔شاعری ابتذال کی حد تک پہنچ گئی۔زنانہ محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بیگماتی زبان میں ہونے لگا۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے
کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں۔

ناسخ

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

نامعلوم

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

خلیل

شب ہجر وادیٔ وحشت ہے
دیدہ غول ہے چراغ اپنا

نامعلوم

یہی کہہ کہہ کے رند روتا ہے
پھوٹیں آنکھیں جگا دیا کس نے

نامعلوم

شعرائے لکھنوء کی ایسی ہی شاعری کی پیشِ نظر ناقدین نے اسے کنگھی چوٹی کی شاعری قرار دیا۔غزل کی عشقیہ شاعری میں یہ تصور اور رواج اتنا زور پکڑا کہ بیشتر شعراء اس کی تتبع میں شعر کہنے اور اسی کی پیروی کرنے لگے۔ بالآخر غزل گل وبلبل کی حکایتوں، عشق وعاشقی کی کیفیتوں اور ہجر ووصال کی داستان بن کر

رہ گئی۔اسی نوعیت کی شاعری پر حالی نے کاری ضرب لگائی اور اسے ناپاک دفتر قرار دیا۔آگے چل کر کلیم الدین احمد نے اس کو نیم وحشی صنف کہا اور عظمت اللہ خان نے گردن زدنی کا فتویٰ صادر کیا ۔غزل کی سخت جانی دیکھئے کہ اس پر شدید حملوں کے باوجود نہ صرف آب وتاب کے ساتھ زندہ ہے بلکہ مسلسل ترقی کے مراحل طے کرتی جا رہی ہے۔ جہاں دیگر مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دیتی رہی وہیں عشقیہ مضامین سے لیس ہوتی رہی ہے۔

اقبال نے محض غزل کی روایت کو آگے نہیں بڑھایا بلکہ اسے وسعت عطا کی۔انہوں نے غزلوں میں عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی کے جلوے دکھائے۔

بدلتے ہوئے عقائد ونظریات اور ضروریات نے عشق کے انداز بدل دیئے۔محبوب کی آنکھوں میں کھو جانے اور اس کی زلفوں میں اسیر ہونے، ہجر ووصال کے سوز وگداز قصوں کو بیان کرنے، محبوب کے گلی کوچہ کو اہمیت دینے اور رقیب کی شکایت کرتے رہنے الغرض عشق کو ہی حاصلِ زیست سمجھنے والے شعرا نے غم دوراں کو محسوس کیا۔غم دوراں کو غم جاناں پر فوقیت دینے لگے۔ بالآخر انہوں نے غم دوراں کو غم جاناں میں ملا دیا۔حالانکہ یہ سلسلہ حالی اور محمد حسین آزاد کے قائم کردہ اصولوں کے تحت وجود میں آچکا تھا۔آگے چل کر ترقی پسند تحریک کے متوالوں نے یہی رویہ اختیار کیا۔ترقی پسند تحریک کے متوالوں اور حلقۂ ارباب ذوق کے حواریوں کو عشق تو دور انہیں غزل سے ہی چڑ تھی اس لئے انہوں نے غزل کو پس پشت ڈال دیا۔ان کے سامنے عشق وحسن کے فسانوں سے زیادہ روزی روٹی کا مسئلہ درپیش تھا اور انقلاب اور تحریکِ آزادی کے نعرے تھے محبوب کے حسن کو بیان کرنے سے زیادہ انہیں نوجوانوں میں تحریک آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا لہٰذا انہوں نے اپنا انداز بدل دیا۔فیض احمد فیض کے یہاں یہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے ان کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں کا امتزاج موجود ہے۔فیض معشوق کی آنکھوں میں کھو جانے کی بجائے غم دنیا میں گم ہونے اور قوم ووطن کے سلگتے مسائل کو اجاگر کرنے کو اہم جانتے ہیں اور اپنی محبوب سے

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

کا تقاضہ کرتے ہیں انہیں احساس ہے کہ ان کا محبوب مل بھی جائے تو دنیا کے غم یوں ہی رہیں گے۔کیفی اعظمی اپنے محبوب کو اپنے ساتھ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

زندگی جہد میں ہے صبر کہ قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں ہے
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں ہے
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں ہے
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ چلنا ہے تجھے

مجروح سلطان پوری اپنے محبوب کو متمنّی کرتے ہیں کہ رقص کرنا ہے تو پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ، حتیٰ کہ رومانیت کا شہید مجاز اپنے محبوب کے آنچل کو پرچم کے روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس طرح عشق کا تصور نئی کروٹیں لینے لگتا ہے۔کیونکہ اب نہ وہ عشق تھا اور نہ ہی وہ عشاق تھے، جو عشق تھا اس میں وہ تپش تھی اور نہ وہ حرارت، وہ سوز وگداز تھا اور نہ ہی درد جو قدماء کا اثاثہ تھا اور نہ ہی وہ دربار تھے جہاں شعرا کی خوب سرپرستی ہوا کرتی تھی۔اب زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا جس کی بدولت شعرا کو زندگی کا احساس ہو چلا تھا۔اسی لئے ترقی پسند تحریک کے شیدائیوں نے اپنے اصولوں کے تحت ادب تخلیق کرنا شروع کیا جو انسان کی فلاح

وبہبودی کے لئے تھا اور جس سے تعمیری کام لیا جا سکتا تھا۔لہٰذا انہوں نے غزل کی بجائے نظموں کو اہمیت دینی شروع کی۔ان کی نظروں میں غزل محض تفریح کا سامان تھی۔اس دور میں حسرت، فانی، جگر اور اصغر نے غزل کی ڈوبتی نیّا کو سہارا دیا اور اس کی روایت کو آگے بڑھایا۔الغرض فانی زندگی کے درد وسوز کے ساتھ عشق کا بیان کرتے رہے۔حسرت نے بھی اپنی غزلوں میں عشق کا ایک جامع تصور پیش کیا۔اسی کشمکشِ زندگانی کے درمیان جگر نے بڑی بے باکی سے عشق کا مظاہرہ کیا اور ایک منظم رنگ عشقیہ شاعری کو عطا کیا۔فراق بھی زندگی کے دیگر مسائل بیان کرتے ہوئے عشق وعاشقی کی باتیں کرتے رہے۔

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا؟
فراق

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
فراق

نام بھی لینا ہے جس کا اک جہانِ رنگ و بو
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے
فانی

مآلِ سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ
فانی

حسن بے پرواہ کو خود بین وخود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
حسرت

دیارِ شوق میں برپا ہے ماتم مرگِ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاک باز اس کا
حسرت

اہلِ رضا کی جان ہے اتنی سی یہ امید
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں
جگر

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
جگر

پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون ''جگر میری نظر میں'' میں حسرت اور جگر کی عشقیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن وعشق کے شاعر ہیں لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزل خواں ہوتا ہے۔۔۔۔۔جگر محبت کے شاعر ہیں حسرت محبوب کے! جگر دوری اور مجبوری کی عظمت کے قائل ہیں۔۔۔۔۔جگر متاع اور قیمت کے نازک اور گراں بہا رشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور برتتے ہیں۔۔۔۔۔اب تک یہ روایت چلی آتی تھی کہ شعراء عاشق کے جذبات واحساسات کی ترجمانی پر پورا زور صرف کر دیا کرتے تھے۔جگر کے یہاں محبوب کے جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔''

عشق کی یہ کیفیت ان کے بعد کے اکثر شعرا میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔مگر کسی کے یہاں کم تو کسی کے یہاں زیادہ۔

ملک آزاد ہوا اور تقسیم بھی ہوا۔زندگی کا رخ بدل گیا۔نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔شعبہ ہائے زندگانی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔نئے نئے رجحانات شروع ہوئے۔جنہیں جدید، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور جدید تر کے ناموں سے پکارا جانے لگا۔جب سے ان رجحانات کا آغاز

ہوا، غزل گو شعرا کی ذہنیت میں بھی نمایاں تبدیلی ہوگئی۔اس طرح دیکھا جائے تو آج کی غزل میں خالص عشقیہ عناصر خال خال ہی ملیں گے۔آج کی غزل میں زندگی کے نئے اور پیچیدہ میلانات و مطالبات سے متعلق بلیغ اشارے دکھائی دیں گے۔یہ سلسلہ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔لہٰذا اب نئے تقاضات کے تحت غزل میں عشق کا تصور پیش کیا جانے لگا۔دورِ حاضر کی غزل میں حسن و عشق کے جلوے اور محبت کے جذبات و محسوسات دیکھنے کی سعی کی جائے تو یہاں شاعر کا رویہ خاصہ بدلا ہوا پائیں گے۔حالانکہ زندگی میں عشق و محبت کی اوّلیت اور مرکزیتِ سے انحراف کرنا غالبؔ نے سکھایا تھا۔اس تصور کو فراقؔ اور یگانہؔ نے آگے بڑھایا۔الغرض آج کی تیز رفتار زندگی کی کشمکش کے سامنے غزل کے آداب اور عشق کے آداب شکست کھا چکے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ آج کے شعرا بھی عشق و عاشقی کی باتیں کرتے ہیں اور حسن کے گیت گاتے ہیں لیکن نہ ان کے عشق میں وہ حرارت اور وہ وجدانی کیفیت ہے اور نہ ہی عشق میں جلنے کی تڑپ اور امنگ۔پھر بھی چند ایک شعرا کے یہاں ایسی عشقیہ شاعری مل جائے گی جسے پڑھ کر قدیم شعرا کی یاد تازہ ہوجائے گی۔مثلاً

یہ نہ سوچو کہ بے ثبات ہو تم
میرے حصّے کی کائنات ہو تم

ساغر کرناٹکی

یہ مہر و ماہ نہ چمکیں تو غم نہیں کوئی
وہ مسکرائیں تو ہر سمت نور ہوتا ہے

ڈاکٹر داؤد محسنؔ

آج کے اس پُرخطر اور پُرفتن دور میں جہاں ذہنی سوچ بدل گئی ہے۔شعرا نے بھی اپنا تصور بدل دیا ہے۔حسن و عشق کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان کا اب انداز بدل گیا ہے۔

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں
سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا

حسن نعیمؔ

اظہرِ عاشقی سے ڈرتا ہوں
حسن کی برہمی سے ڈرتا ہوں

ڈاکٹر داؤد محسنؔ

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

ناصرؔ کاظمی

نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شئے کا کیوں ازل سے انتظار ہے

شہریار

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

بشیر بدر

موجودہ دور کی غزل میں محبت کی دھیمی دھیمی کسک تو ضرور ملتی ہے مگر تصورِ عشق کی وہ وسعتیں نہیں ملیں گی۔اب نہ عشقِ حقیقی کی بہاریں دکھائی دیتی ہیں اور نہ عشقِ مجازی کی جگمگاہٹیں۔اس لئے کہ فی زمانہ انسانیت دم توڑ رہی ہے جہاں زندگی کی ساری قدریں پامال ہو چکی ہیں۔دنیا خوفناک دور سے گذر رہی ہے۔آج کا شاعر حیات اور موت کی کشمکش میں اپنا وجود کھو چکا ہے۔اس کے پاس نہ تو متاعِ حیات ہے اور نہ متاعِ حسن و عشق۔

•••

شہریار کی نظمیاتی شاعری

(اسم اعظم کے پس منظر میں)

ڈاکٹر ساجد حسین انصاری
(شعبہ اردو) سینٹ اینڈریوز پی.جی.کالج، گورکھپور
موبائل9415668187

نظم کے تعلق سے بات کی جائے اور شہریار کا ذکر نہ ہو ایسا غیر ممکن ہے۔شہریار نے اپنے مافی ضمیر اور زمانے کے نشیب وفراز کو زیادہ تر اپنی نظموں کے توسط ہی سے معکوس کیا ہے اور اس احساس کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادیت پرستی اور سہل پسندی کے اطوار نے ہماری ذہنی کاوشوں کو کافی حد تک آرام طلب اور غیر حساس بنادیا ہے۔آسائش اور سہولیات کے تناظر کا بغور جائزہ لینے پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ جیسے جیسے ہم آسائشوں اور سہولیات کے گرویدہ ہوتے جارہے ہیں ویسے ویسے ہمارے دیگر مسائل بھی بڑھتے جارہے ہیں، روزافزوں بدلتے ہوئے حالات اور مسائل سے انسان ذہنی طور پر مفلس ہوجاتا ہے اور روحانیت کے زوال میں مبتلا ہوجاتا ہے۔مشرق جس نے ہمیشہ روحانیت کو مادّیت پر ترجیح دی وہ اس بدلتے وقت سے ہمیشہ پریشان رہا۔حد تو یہ ہے کہ مغرب بھی آج اس کرب سے دوچار ہے جس کے اثرات ہمیشہ منفی اور مثبت دونوں لحاظ سے دکھائی دے رہے ہیں۔

ایک طرف اپنی ذات کے عرفان کی کوشش ہے تو دوسری طرف سستے تکریمی مشاغل میں الجھ کر خود کو کھو دینے کی شدید تمنا ہے، اس کشمکش نے بیک وقت ادب اور آرٹ کو فروغ دیا۔چیختے ہوئے رنگوں سے نجات حاصل کرنے کی تمنا، خاموشی، خودفراموشی اور خارجی وجود سے انکار، یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ نظام میں اعصاب کو جھنجھوڑتے ہوئے رنگوں اور زاویوں کی مدد سے ایک ایسے جہنم کی تشکیل و تعمیر جہاں کچھ بھی زندہ اور خوبصورت نہ رہ جائے۔آج کے دور کی بدقسمتی ہے کہ منفی رخ کو زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے اور اپنے وجود کی بازیافت کا مسئلہ مصنوعی وجود کی گرفت سے آزاد ہونے کی تحریک پیدا کررہا ہے - جب معاشرہ شکست وریخت کا شکار ہوجاتا ہے تو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔دوسری طرف یہ بھی حقیقت کہ ایسے پرانتشار دور میں ادب ہی ایک ایسی طاقت ہے جو ان منفی رویوں سے ٹکرا سکتا ہے اور اس کے اثر کو زائل کرسکتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری سے ہم کیا مطالبہ کرتے ہیں؟ آج کل جدید ہیئت کی جس اصطلاح کا چرچا عام ہے اسے ہم شعری عمل پر کس حد تک منطبق کرسکتے ہیں۔ٹی.ایس.ایلیٹ کے نزدیک سچی شاعری کی تنظیم وتشکیل روح یا باطن کی بساط پر ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ خارجی تحریروں کے ساتھ ساتھ جب تک شاعر اُن تحریروں کو اپنے باطن میں اتار نہیں لیتا تب تک وہ ایک سچی اور اچھی شاعری نہیں کرسکتا۔شاعری کا اصل حسن موضوع کے توازن اور فنکارانہ اظہار میں مضمر ہے۔عصری حسّیت جزوی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ بیرونی عمل کی حد تک اسے وقت اور مقام کی قید سے آزاد نہیں کیا جاسکتا لیکن جب یہی عصری حسّیت اور حقائق احساس کے وسیلے سے تخلیقی سفر کا حصہ بنتے ہیں تو اس کی حیثیت محدود نہیں رہ جاتی اور یہ تاثر اور مفہوم ایک اضافی حقیقت میں بدل جاتا ہے اور پھر دائرہ در دائرہ تہ در تہ اور آئینہ در آئینہ احساس کی لہروں میں نمودار ہوتا ہے اور غالباً اسی لئے فن کو حقیقت کا اظہار بلکہ ادراک قرار دیا گیا ہے۔

'اسم اعظم' جو کہ شہریار کا پہلا شعری مجموعہ ہے اس کی پہلی نظم ''خواب'' سے لے کر ''وقت''، مستقبل، موت، آرزو، آدرش، دھندلکا، مآل، عرفان، اجنبی، سائے، افسوں امروز، ماضی، ایک منظر، وہ آسمان، وہ کون تھا، لازوال سکوت، خوابوں کا بھکاری، پرچھائیاں، نیند کا جادو، آخری منزل، نیند کا سیلاب، ایک اور موت، سائے کی موت، ایک رات ایک منظر اور آخری نظم 'ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک' ان چند نظموں کے عنوانات کی نفسیات کا اگر جائزہ لیا جائے تو شہریار کے شعوری کردار اور ذہنی انسلاک کے تعین میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، ان سب میں ایک طرح کی سحر انگیزی اور پر مسرت فضا ملتی ہے۔ گہری نیند سے چونکنے اور تاب نظارہ نہ لا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لینے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ یہ سبھی نظمیں عصری مسائل کے حملے سے ابھرنے والی باطنی کشمکش، بے چینی اور اداسی کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان نظموں کے کینوس پر وہ تمام رنگ پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن میں شکست کے احساس سے دوچار تھکی ہوئی نسل کی جراتوں کا عکس بھی صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان نظموں میں کسی فلسفیانہ تجربے کے بجائے ایک عصری حیثیت سے متاثر ہونے والا ذہن دکھائی دیتا ہے جو کسی نظریہ، عقیدے اور مخصوص طرز فکر کو اپنا ہم سفر بناتا ہے اور نہ ہی قدروں کی پامالی پر دوسروں سے ذہنی توازن کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی خوابوں کو پامال کرنے والی مکروہ حقیقتوں کے خلاف کوئی احتجاج یا نفرت دکھائی دیتی ہے۔

دور پلکوں سے آنسو کے قریب
نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے
خواب تعبیر کے شکستہ دل
آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں

(خواب)

☆

ابھی نہیں ابھی زنجیر خواب برہم ہے
ابھی نہیں ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ابھی در باز ہے امیدوں کا
ابھی نہیں ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں ابھی کمبخت دل دھڑکتا ہے

(موت)

☆

جلاوطن نکہتوں کی نظریں
کسی کی آمد کی منتظر ہیں
زمین محور سے ہٹ رہی ہے

(مستقبل)

☆

قاصد اِن عمر رفتہ کا خیال
کیا یہی ہے حسرت دل کا مآل

(مآل)

☆

مجھے اپنی اور اپنے جیسے
سیہ بخت انسانوں کی جستجو ہے
ازل سے ابد تک کی لمبی مسافت
اسی جستجو کے سہارے
مجھے کرنی ہوگی

(عرفان)

☆

اک گھنیرے شجر کے سائے میں
دو گھڑی بیٹھ کر یہ بھول گئے
قرض ہائے جنوں چکانے ہیں
ہم کو سورج کے ناز اٹھانے ہیں

(آشوب آگہی)

☆

وہ بجھا ہوا داغ، وہ شعلہ ہوا سرد
وا در خواب ہوا ختم ہوئی سوزش درد
ہر طرف نیند کی گرد

(دن کا عذاب)

مذکورہ بالا ان سبھی نظموں سے شہریار کے تخلیقی سفر کی ابتدائی منزلوں، اس کے محرکات، فکری اساس اور مذاقِ فن کے تمام زاویوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان نظموں میں اجتماعی اور انفرادی تجربوں کی وہ داستان پوشیدہ ہے جن سے عصری تہذیب اور مہذب انسانوں پر اس تہذیب کے ردعمل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آج کے مادیت پرست معاشرے کی خود غرضی، نفس پروری، رشتوں کا ٹوٹنا اور سماجی تعلقات کا بے حرمت ہونا، ترقی کی دوڑ کے آگے انسانوں کی بے بسی اور لاچاری، حقائق و نظریات کے بے معنویت وغیرہ، عصری زندگی کے وہ مسائل ہیں جن کا شہریار کے یہاں تاثر دو شکلوں میں ابھرتا ہے۔ پہلی شکل حیرت کے ساتھ معصومانہ خواہشوں سے عبارت ہے، جس کا اظہار ''خواب، مستقبل اور موت'' وغیرہ نظموں میں دکھائی دیتا ہے اور دوسری شکل ''پیغام، شمع آشفتہ سر، دن کا عذاب'' وغیرہ نظموں میں دکھائی دیتی ہے جس میں حیرت واستعجاب نے نیم فلسفیانہ حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ان نظموں میں اداسی، پیش معانی، اجتماعی حماقتوں اور جرائم میں اشتراک کی وجہ سے اپنی ذات پر طنز دکھائی دیتا ہے۔

'اسم اعظم' کی اشاعت ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ اس وقت شہریار عمر کی تیسویں منزل کے قریب تھے، ظاہری بات ہے کہ اوائل بلوغ کا جذباتی ساز رفتہ رفتہ پختگی کی طرف گامزن تھا۔ شہریار کی فکر نے خارجی تجربوں کو باطنی تاثر کے ساتھ ''اسم اعظم'' کی نظموں میں پیش کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر تقی حسین جعفری:

''(شہریار) ان کی کئی نظمیں فکر و احساس کی صداقت سے مملو نظر آتی ہیں، ان کی لفظیات نئی اور پیکر تراشی میں ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے ''اسم اعظم'' کی نظموں میں خاص طور سے ایک عجیب غیر مرئی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے، یہ کیفیت بڑے غیر محسوس طور پر قاری کو شاعر کے خوابوں کا شریک بنا دیتی ہے۔[1]''

جب ہم شہریار کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان کی شاعری مثبت ہے یا منفی قنوطی ہے یا رجائی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرانے معنیٰ میں ان کی شاعری قنوطی ہے نہ رجائی اور نہ ہی اس سے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ منفی۔ یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ ہم شاعری کے متعلق روایتی انداز پر مقصدی اور اصلاحی نقطہ نظر سے غور کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اردو شاعری حالی اور سرسید کے دور سے لیکر اقبال اور جگر مرادآبادی تک کئی لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ آج کی شاعری براہ راست سماجی اور سیاسی نوعیت کی نہیں ہے، آج کا دور آگہی کے آشوب کا دور ہے اس لئے آج کا انسان اپنے شعور کے ہاتھوں پریشان ہے، اس کے دکھ درد اور غم کی نوعیت بالکل جدا ہے۔

آج کے انسان کی الجھنیں اور اس کے مسائل بھی گزشتہ دور کے انسانوں کے مسائل سے یکسر مختلف ہیں اور آج کے مسائل کا حل بھی اس دور کے انسانوں کو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس لئے آج کی شاعری نتائج یا پیغام کی شاعری نہیں ہے اس معنی میں آج کی شاعری میں مثبت اور منفی اثرات کی نشاندہی تو کی جاسکتی ہے لیکن کوئی واضح فیصلہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس طرح کی کوششیں بھی کی گئیں جو ہر لحاظ سے معصومانہ قرار دی جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نئی شاعری بنیادی طور پر اس دور کے مایوس اور زخم خوردہ انسانوں کی اندرونی پیاس، روحانی کرب اور شعوری الجھنوں کی شاعری ہے۔ یہ ایک طرف خواب اور آگہی ہے تو دوسری طرف موت اور وقت کی متضاد قوتوں کے درمیان کشمکش میں الجھی ہوئی ہے اور زندگی کی معنویت کی تلاش و جستجو میں سرگرم عمل ہے اور زندگی کے اصلی چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے خود نہیں معلوم کہ آج کے

انسان کی آئندہ منزل کون سی ہوگی اور اس دنیا کے نزدیک کوئی اور دوسری دنیا بھی ہے چنانچہ آج کی شاعری کے متعلق مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خوشی اور غم کے لمحوں کے احساس کی شاعری ہے۔

شہریار ایک بڑے شاعر ہیں ان کی فکر وسیع ہے اس لئے ان کی شاعری میں ان کے ذاتی دکھ درد صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ یہ دکھ درد عام انسانوں کے دکھ درد بن کر ابھرتے ہیں۔شہریار چونکہ زندگی کی مثبت قدروں کے پرستار ہیں اس لئے وہ انسان کے اعلیٰ بنیادی قدروں کی تلاش میں سرگرم عمل ہیں۔وہ مسرتوں سے لبریز ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں جہاں انتشار کے بجائے امن ہو، ذاتی رشتوں کی کڑواہٹ کے بجائے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے اپنا دامن بھر لینے کی آرزو ہو، ظاہری بات ہے کہ شہریار کے یہ خواب اور تمنائیں آج کے دور کے ہر انسان کا خواب اور اس کی تمنا ہیں۔زندگی کی سفاکیوں اور کڑے کوس کا یہ سفر انسان سے اس کا سب کچھ چھین لیتا ہے۔انسان حالات کا شکار ہو کر وقت کی قید میں چھٹپٹاتا ہے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں اسے لمحہ لمحہ قتل کرتی ہیں لیکن وہ وقت اور حالات کے ہاتھوں اسیر ہو کر اپنی موت کا تماشا روز دیکھا کرتا ہے، زندگی کی یہ ضرورتیں اس سے روز خراج وصول کرتی ہیں اور وقت کے ہاتھوں لاچار اور بے بس ہو کر وہ انھیں ادا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔اس خیال کو شہریار نے اپنی نظم 'عہد حاضر کی دلربا مخلوق' میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو،غم،امید،محرومی
نیند کی گولیاں،گلاب کے پھول
کیلے،امرود،سنگترے،چاول
پینٹ،گڑیا،شمیز،چوہے دان
ایک اک شئے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دلربا مخلوق

(عہد حاضر کی دلربا مخلوق)

زندگی کے سنگلاخ میدان کو عبور کرنے کے لئے انسان کے پاس چھوٹی چھوٹی آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں لیکن ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل میں اسے جس کرب سے گزرنا پڑتا ہے وہ کرب انسان سے ایک اک شئے کا حساب لے لیتا ہے، یہی فضا اس مجموعے کی تقریباً سبھی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ایک دوسری نظم ''اسٹل لائف'' یعنی ٹھہری ہوئی زندگی کے چند اشعار دیکھئے۔

پھول،پتیاں،شاخیں
ہونٹ،ہاتھ اور آنکھیں
موج خوں،صدائے دل
ماہتاب اور سورج
منجمد ہیں سب کے سب

(اسٹل لائف)

وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

پھول،پتیاں،شاخیں،ہاتھ،آنکھیں،سورج اور صدائے دل، ماہتاب اور سورج یہ تمام اشیاء ایسی ہیں جو انسان کو لذت دے سکتی ہیں یا وسیلۂ لذت بن سکتی ہیں لیکن حالات کے جبر نے انہیں ایک منجمد شئے بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے انسان بجائے اس سے لطف اندوز ہونے کے ان اشیاء سے محروم ہے اور یہ اداسی اور محرومی اسے مایوسی کے گہرے سمندر میں ڈھکیل دیتی ہے جہاں وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا اور رفتہ رفتہ مایوسی کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

شہریار انسانی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں اسی لئے زندگی کے بظاہر معمولی لگنے والے واقعات پر بھی ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔بظاہر ان معمولی لیکن حقیقتاً بہت اہم واقعات سے وہ سماج کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس کو دیکھ کر انسان چونک اٹھتا ہے اور اس کے

دل کو ایک ٹھیس سی لگتی ہے۔شہریار کی نظم 'نیا امرت' بظاہر بہت معمولی لیکن حقیقتاً بہت اہم المیہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔وہ کہتے ہیں۔

دواؤں کی الماریوں سے سجی ایک دکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انسان کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو 'زہر' لکھا ہوا ہے

(نیا امرت)

اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے

اس نظم کی پوری فضا غم انگیز ہے۔نظم جب ختم ہوتی ہے تو قاری چونک اٹھتا ہے اور اس کے دل پر صدمہ گزرتا ہے کہ آج انسانوں نے کتنی ترقی کر لی ہے، چاند پر بستیاں بسانے کا آرزومند ہے لیکن دوسری جانب اس دھرتی پر جو کہ اس کی اپنی ہے ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو جینا تو چاہتے ہیں لیکن زمانے کے حالات قدم قدم پر اسے جینے سے روکتے ہیں اور انجام کار وہ زہر کی شیشی میں رکھے ہوئے زہر سے زندگی کی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کا سودا کر لیتا ہے۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''شروع شروع میں شہریار ہمارے سامنے ایک خوفزدہ لیکن نیم تماشائی نوجوان کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ان کی بہت شروع کی ایک نظم میں ایک شخص زہر کی شیشی ہاتھ میں لئے ہوئے دکھایا گیا ہے اور شاعر یہ پوچھتا ہے کہ یہ کیسا مرض ہے اور کیسی دوا ہے۔اگر شہریار اس خوفزدگی کی بھی منزل میں رہ جاتے تو نئی شاعری میں ان کے نام کا کوئی صفحہ نہ لکھا جاتا۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تجربے اور جذبے دونوں کو بہت جلد وسیع کر لیا اور یہی نہیں بلکہ اکثر ایک تجربہ کا بدل اس کا متضاد تجربہ اور ایک جذبے کا جواب اس کا متضاد جذبہ دریافت کر لیا۔چنانچہ حسیاتی اور جذباتی سطح پر ردعمل کی جتنی فراوانی اور جتنا تنوع شہریار کے یہاں ملتا ہے وہ کسی بھی معاصر شاعر کے حصہ میں نہیں آیا۔خوف اور خوفزدگی، بے چینی اور اکتاہٹ، طنز اور ہمدردی، بے چارگی اور جارحانہ پن، استفہام و انکار، گریز اور استقبال، جوش اور سردمہری، وفاداری اور ہرجائی پن، عشق کی صداقت اور اس کا جھوٹ، یہ اور اس طرح کی تمام جذباتی پیچیدگیاں شہریار کے یہاں اپنے پورے تنوع کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔''[۴]

انسان کو چھوٹی چھوٹی لذتوں سے محروم رکھنے میں جہاں حالات کے جبر کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہیں فطرت بھی کبھی کبھی اچھا مذاق کرتی ہے، فطرت کے اسی جبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''بارش'' نامی نظم میں شہریار کہتے ہیں۔

اکتائے ہوئے ہم بھی ہیں بہت
گھبرائے ہوئے ہم بھی ہیں بہت
چومیں کسی پرچھائیں کی پیشانی کا سورج
دیکھیں کسی خوشبو کا بدن ہم بھی برہنہ
نغمہ سنیں ہم بھی کسی دیوار کے لب سے
سڑکوں پہ پتنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

(بارش)

بارش کے سبب سے انسان کتنا مجبور ہے کہ وہ قدم قدم پر مسائل و ناموافق حالات سے دوچار ہے۔فطرت کے جبر نے اس کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان میں حالات کو بہتر بنانے کی تمنا بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، جب ادھر سے تقاضے شدید ہوتے ہیں تو انسان گھبرا کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے یہی چند لمحے اس کے لئے بہت خطرناک ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی امید کی کوئی ہلکی سی کرن خواہ وہ فریب ہی کیوں نہ ہو اسے تازہ دم کر دیتی ہے تو ایک بار پھر وہ اپنی ساری قوتیں جمع کر کے مخالف حالات سے لڑنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، یہی خواب انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں
یہاں وہاں کچھ چراغ رکھے
تمام شب غم گساریاں کیں

(ایک اداس رات)

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں

زندگی پر ایمان اور بہتر مستقبل کی امید شہریار کی شاعری کا وہ جوہر ہے جو پرآشوب حالات میں بھی انسان کو جینے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ شہریار کی شاعری کے اس اہم وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں:

''ان کے جذبے اور احساس کے کرب کی صداقت ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے اور ہمارا ذہن زندگی سے متنفر ہونے کے بجائے حسین خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔'' ۵

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''کائناتی تناظر پر اصرار کے باعث شہریار کی نظموں میں وقوعہ بہت کم نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے دوسرے شعراء نظم کو کسی وقوعے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ یہ وقوعہ صیغۂ حال میں بیان ہو یا ماضی میں لیکن دونوں صورتوں میں واقعیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس احساس کی وجہ سے نظم میں 'معاصریت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن کائناتی حوالہ ہلکا پڑ جاتا ہے۔ وقوعے کو نظر انداز کرنے کی بنا پر اسے واقعی سطح پر نہ برت کر شہریار کی نظم علامت کے قریب جا پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حالیہ نظموں میں سفر، خواب، کشتی، دریا، بھنور اور اسی طرح کے وہ الفاظ نظر آتے ہیں جو کائنات میں انسان کی روح کی آرکی ٹائپ Archetype ہیں۔'' ۶

شہریار کے مجموعے کی ایک نظم ''آخری کوشش تو کرنی ہے'' مکمل طور پر ایسی نظم قرار دی جا سکتی ہے جو شدید مایوسی اور نا امیدی کی فضا میں بھی ہمت و حوصلے کا ایک روشن چراغ کہی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل کی نظم میں زندگی کے تعلق سے دیکھے گئے خوابوں کی شکستگی کے باوجود امید کی کرن جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس نظم میں وہ پوری طرح ایک مینار بن کر ہمارے حوصلوں کو تقویت دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر زندگی کے مخالف حالات یعنی جبر کی قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور وہ آخری لمحے تک مخالف حالات میں جینے کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش اس کا سرمایہ ہے وہ کہتا ہے۔

مانا ہیں شل ہاتھ تمہارے
مانا ہیں پتوار پرانے
مانا ساحل دور بہت ہے
مانا دریا ہے طوفانی

(آخری کوشش تو کرنی ہے)

کشتی پار نہیں ہونے کی
آخری کوشش تو کرنی ہے

اس نظم میں مانا لفظ کی جو تکرار ہے وہ اپنے اندر بہت معنویت رکھتی ہے۔ مخالف حالات جو ایک دریا کے مانند ہیں اور ایسے حال میں ہمارے وجود کی کشتی پار نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے ہاتھ شل ہیں اور شل ہاتھ میں جو پتوار ہیں وہ بھی پرانے ہیں بچنے کی کوئی امید تو بظاہر نظر نہیں آتی کیونکہ ہمارے وجود کی کشتی طوفانی دریا کی زد میں ہے۔ ان تمام مخالف حالات میں صرف ایک چیز ہی حوصلہ بخش ہے اور وہ یہ کہ ہمیں جیتے جی اپنی ذات کی حفاظت کرنی ضروری ہے اور یہی آخری کوشش ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے کیونکہ اسی کے نتیجے میں ہم عمل اور حرکت کی بیش بہا دولت سے سرفراز ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ عمل کی یہ دولت ہمارے وجود کی کشتی کو طوفانی دریا سے ثابت و سالم گزار کر امید افزا ساحل کے کنارے لگا دے۔

ان نظموں میں ''نیند سے آگے کی منزل، سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو، لمبی چپ کا نتیجہ، میں ڈرتا ہوں، اس اداس شام تک، جینے کی ہوس، ایک سچ، تجھے کچھ یاد آتا ہے، صبح سے اداس ہوں، سزا پاؤ گے، جاگنے کا لطف، سحر کا خوف، جینے کی لت'' شامل ہیں۔

مذکورہ بالا نظمیں اپنے موضوع اور اندازِ بیان کے لحاظ سے انوکھی ہیں۔ ان نظموں میں زندگی کے سکھ دکھ، خوشی و غم، امید و یاس، کامیابی و ناکامی کو ایسے لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جاتا ہے اور ان نظموں کے اثرات دیر تک اس کے ذہن و دل کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔

•••

بچے کی نفسیات اور ادب اطفال

(6 سے 12 سال تک کے بچوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے، اکیسویں صدی کے بچوں کے تناظر میں)

صالحہ صدیقی
ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Mob. 9899972265

''بچہ'' جس کی زندگی ایک سفید کورے کاغذ کے مانند ہوتی ہے، جس کی زندگی میں رنگ اس کے والدین، بزرگ، استاد، اس کے آس پاس کے ماحول، سماجی، سیاسی فضا مل کر گھولتے ہیں، اس کی شخصیت کو اثر انداز کرتے ہیں۔ یہ نقوش تا عمر اس کے ذہن و دل پر نقش رہتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

'' ''بچہ'' 'لا' سے اثبات پیدا کرتا ہے اور تخیل کی ایک دنیا آباد کرتا ہے الگ الگ چیزوں کو نئی شخصیت دے کر نئے نام سے پکارتا ہے۔ ٹانگوں میں لکڑی لے کر گھر بھر میں اسے گھوڑا بنائے دوڑائے پھرتا ہے۔ گڑیا کو سامنے بٹھا کر اس سے باتیں کی جاتی ہیں۔ تکیہ کو ماں سمجھ کر سینے سے لگایا جاتا ہے۔ یہ انھیں حقیقی سمجھتا ہے اور دنیا انھیں کیا سمجھتی ہے اس کی اسے پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ بچہ ہے نارمل بچہ! ہمارا آپ کا بچہ۔'' (بحوالہ: ڈاکٹر سلیم ختر ''بچہ اور کتاب نفسیات کی روشنی میں'' ماہنامہ ماہ نو۔ لاہور، نومبر ۱۹۷۹ء، ص ۵۳، چیف ایڈیٹر کشور ناہید)

بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی مکمل نشو نما تک علم نفسیات بہت اہم رول ادا کرتا ہے، بچوں کی نفسیات ہی بچوں کے ادب کو جنم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے پڑھنے کی عادت اور بڑھتی ہوئی دلچسپی ہی نے بچوں کے لیے ایک الگ ادب کو جنم دیا جس کو آج بچوں کا ادب کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو بچوں کے ادب کی بنیاد ان لوریوں سے ہی ہو جاتی ہے جو ان کو سلانے کے لیے 'ماں' گنگناتی ہے۔

اس لیے ادب اطفال انسانی ترقیات کے ساتھ ساتھ گامزن رہا ہے، بچوں کا ادب ان کی نفسیات اور ان کی ضروریات اور ان کے بڑھتی عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا جاتا ہے مثلاً لوری، نظم، گیت، کہانی، تصویر، قصے، ڈرامے، مضمون اور اس قسم کے مختلف اصناف بچوں کے لیے لکھے جاتے ہیں، تاکہ بچوں میں بچپن سے ہی مطالعہ کی عادت ڈالی جا سکے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بدلتے وقت اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ بچوں کے ادب میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے تہذیب و تمدن میں تبدیلیاں آتی ہے بچوں کی نفسیات بھی متاثر ہوتی رہتی ہیں، اگر ہم دو سو سال کے پہلے کا ادب دیکھیں اور آج کے ادب کو دیکھیں تو آج کے اور اس وقت کے ادب و ماحول، سماجی، سیاسی، معاشرتی حالات نیز اخلاقی و مذہبی رجحانات میں بھی زمین آسمان کا فرق با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آج دنیا ترقی کی طرف گامزن ہے جدید سائنسی آلات، ایجادات، انکشافات اور جدید ٹکنالوجی نے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی زندگی میں بھی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ آج کے بچے بھی پہلے کی طرح نہیں رہے بچے حال میں ست ہیں اور ذہنی اعتبار سے بہت سمجھدار ہیں اس بات سے میری مراد یہ ہیں کہ آج اکیسویں صدی کے بچوں کی اگر ہم بات کریں تو وہ ٹکنالوجی کی معاملے میں بڑوں سے کہیں زیادہ تیز ہیں پھر چاہے اس کو سمجھنے کی بات ہو یا استعمال کرنے کی، آج کے بچوں کے پاس انفارمیشن، نالج، یا سہولیات کی کوئی کمی نہیں

ہے ایک کلک سے وہ دنیا بھر کی انفارمیشن یا معلومات فراہم کر لیتے ہیں جیسا کہ پہلے نہیں تھا۔ آج بچہ ہر پل کچھ نیا تلاش کرنا چاہتا ہے، ہر پل کچھ نیا دیکھنا، سننا چاہتا ہے ایسے میں یہ بھی بہت بڑا ادب کے لیے مسئلہ ہیں کہ بچے کو نیا کیا دیا جائے۔ بچوں کی قوت متخیلہ بھی بہت تیز ہو گئی ہے ،آج کا بچہ ذہنی طور پر صحت مند ہے وہ زندگی کے ہر میدان میں آگے نظر آنا چاہتا ہے۔

بچے بہت ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی ہوتے ہیں بچوں کا دماغ ہر وقت تلاش و جستجو میں رہتا ہے، ان کے سیکھنے کا عمل ہر لمحہ جاری رہتا ہے ایسی صورت میں بڑوں کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی صحیح دیکھ ریکھ کے ساتھ ان کی صحیح تربیت بھی ہو لیکن بعض اوقات بچوں کی ذہنیت اپنے بڑوں کی غیر دانشمندانہ رویوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بچوں کی نفسیات کا خیال نہ رکھتے ہوئے ان پر بیجا دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بچے بعد میں غصیلے ہونے کے ساتھ زندگی میں کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔

بچوں کے روشن مستقبل کے لیے بہت ضروری ہے کہ والدین بچوں کی نفسیات کے مطابق فیصلے لیں جو اُن کے حق میں بہتر ہو، بچے خود کچھ نہیں جانتے کہ کیا ان کے حق میں بہتر ہے کیا نہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زندگی کے جدو جہد کا مقابلہ بچے کو ہی کرنا ہے اس لیے بہت ضروری ہے کہ شروع سے ہی والدین ان کی خواہشات اور ان کی دلچسپی ،ان کی نفسیات پر گہری نظر رکھیں تا کہ بچے کی دلچسپی اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلہ لے سکے۔

زندگی ہمیشہ ''حال'' میں ہوتی ہے اور وہ مستقبل کی طرف بڑھتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے بچوں کو وہی کتابیں پسند آتی ہیں جو ان کے مستقبل کو سنوارنے میں مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں مافوق الفطرت کردار و واقعات نے اپنی دلچسپی کھو دی ہے۔ اب قصے کہانیوں کے بجائے ایسے گیمس کو اولیت دے رہا ہے جس سے وہ خود کو ہم آہنگ کر سکے یہی وجہ ہے کہ آج بچہ 3DGames جیسے Car Rasing,subway surfers, cookies crush,Candy Crush,Gunshot, Temple Run Train Racing, Angry Birds,Super Adventures وغیرہ جیسے گیمس میں دلچسپی لے رہا ہے جس سے آج کے بچوں کی نفسیات میں بھی زبردست تبدیلی آئی ہے ۔اکیسویں صدی کے بچوں کی ٹکنالوجی سے بڑھتی دوستی کے بہت سے خطرناک نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس میں کئی طرح کی ذہنیت رکھنے والے بچے شامل ہیں جس میں ایک قسم میں شامل وہ بچے ہیں جو گھر والوں کے دباؤ، پڑھائی کا دباؤ، ہر روز بڑھتے کامپٹیشن کی دوڑ، اور گھر والوں سے نہ ملنے والے سپورٹ کی وجہ سے ٹکنالوجی کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی مصنوعی دنیا آباد کرتے ہیں جس کا سب سے برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا سے کہیں دور چلے جاتے ہیں، اور دوسری طرف وہ بچے ہیں جو کسی نہ کسی استحصال کا شکار ہوتے ہیں، وہ خود سے بھاگتے ہیں اپنی باتیں کسی سے کہہ نہیں پاتے ایسے حالات میں وہ ٹکنالوجی کا سہارا لیتے ہیں ایسے بچوں کی معصومیت کا فائدہ اٹھانے اور انھیں اندھیرے میں ڈھکیلنے کے لیے بہت سے خطرناک گیمس بھی منظر عام پر آئے جس سے بچوں کی نفسیات پر بے حد خطرناک اثرات بھی مرتب ہوئے۔ جس کی مثال Blue whale Games ہے۔ جس کا آخری Task موت پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر الگ سے غور و فکر کرنے اور بحث و مباحث کی ضرورت ہے میں اس کی تفصیل میں نہ جا کر اپنے اصل موضوع پر آتی ہوں۔

بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور یہ کوئی ایسا مشکل موضوع بھی نہیں ہے۔ جس کو والدین سمجھ نہ سکیں ۔حقیقت یہ ہے کہ بچے کی حرکتوں ،عادات و اطوار، مزاج، اور اس کے رجحانات کا صحیح پتہ لگانا ہی بچوں کی نفسیات ہے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے سے بچے کا ذہن تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس لیے بچے میں مطالعہ کی دلچسپی اور عادت کو فروغ دینا بہت ضروری ہے، پڑھنا صرف دماغی فعل ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے احساسات اور جذبات کا بھی ارتقاع ہوتا ہے، مطالعے سے مزاج، دلچسپی، خوشی، ہمت، لگن اور خواہشات میں اضافہ ہوتا ہے بچے کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، پڑھنے کے سلسلے میں ولیم گرے کا کہنا ہے کہ:

''روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے رہن، سہن اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لیے شہریت اور انسانی افکار کی وسعت کے لیے دنیا کو سمجھنے کے لیے مذہبی ضروریات کو بڑھانے اور ان کو پورا کرنے کے لیے مطالعہ بہت ہی ضروری ہے۔ زندگی کو رنگین بنانے میں کتابوں کی بہت اہمیت ہے۔''

(بحوالہ: ولیم سی گرے دی ٹیچنگ آف ریڈنگ اینڈ رائٹنگ، ص ۲۴۵)

اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

''بچہ اپنی عمر اور جسم کی بنا پر تو کمزور اور ناتواں ہوتا ہے لیکن دوسروں کا سلوک اس میں عدم تحفظ کے جن شدید احساسات کی آبیاری کرتا ہے وہ اس میں مزید ناتوانی کا احساس پیدا کرتے ہیں یوں کہ وہ خود کو بالکل ہی بے بس، بے کار، اور بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے میں کتاب اس کی ہمت بندھاتی ہے چنانچہ وہ (بچہ) کہانیوں کے کرداروں کے ساتھ اپنی نفسی تطبیق کر لیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ محض قاری سے بڑھ کر ہیرو بن جاتا ہے۔ ادب کی اثر پذیری میں تطبیق کی اپنی نفسیاتی اہمیت ہے۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر سلیم اختر ''بچہ اور کتاب، نفسیات کی روشنی میں'' ماہنامہ نو (لاہور) نومبر سنہ ۱۹۷۹ء ص ۵۵، چیف ایڈیٹر، کشور ناہید)

بچوں کی زندگی میں کتابوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں خصوصا کارٹون کی تصاویر والی خوبصورت رنگ برنگی دلکش کتابیں جنھیں دیکھ کر بچے پھولے نہیں سماتے، اور ان کی دلچسپی کتابوں کے لیے وقت کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں بچوں کے لیے مطبوعہ کتب میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے، بچوں کے رسائل مثلاً گل بوٹے، نور، ھلال، امنگ، بچوں کی دنیا، وغیرہ کے ساتھ اخبارات میں بھی بچوں کے لیے کالم نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ادارے ایسے ہیں جو خاص طور پر بچوں کے لیے ان کی دلچسپی، عہد و ماحول، سماجی ،سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی قدروں میں ہونے والی تبدیلی اور ان تبدیلیوں کا بچوں پر ہونے والے اثرات اور بچوں کے ذہن و دل اور ان کے فروغ میں تعاون کو دھیان میں رکھ کر کتابیں تیار کرتی ہیں تا کہ بچوں کی نہ صرف مطالعہ میں دلچسپی بڑھے، بلکہ ان کا مستقبل بھی سنور سکے، ان اداروں میں سب سے اہم نام NCERT کا ہے جو بچوں کی نفسیات پر نہ صرف گہری نظر رکھتا ہے بلکہ بچوں کی نفسیات کے مطابق کتابوں میں بھی بدلاؤ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پرتھم بکس جو بچوں کی نفسیات کے مطابق ہر طرح کی کتابیں ہر عمر کے بچوں کے لیے تیار کرتا ہے۔

اکیسویں صدی میں ادب اطفال پر بہت زور دیا جا رہا ہے ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ اکیسویں صدی کے بچے جن کی زندگی اتنی فاسٹ ہو گئی ہے، جن کے پاس انفارمیشن کی کوئی کمی نہیں ہے تو ایسے حالات میں کس طرح کا ادب تخلیق کیا جائے کہ بچوں کی دلچسپی مطالعہ کی طرف بھی مائل ہو اس سلسلے میں 18 سے 19 اپریل 2015 میں پرتھم بکس نے اردو اکادمی نئی دہلی کے تعاون سے دو روزہ سمینار منعقد کیا جس میں ادب اطفال سے متعلق مختلف مسائل اور بچوں سے متعلق تخلیقی ادب پر بھی غور و فکر کیا گیا۔ دو دن کے ورک شاپ سے جو باتیں سامنے آئی ان میں سے چند کا ذکر میں یہاں کرنا چاہونگی تا کہ اکیسویں صدی میں بچوں کی نفسیات اور ادب اطفال کو سمجھا جا سکے۔

(۱) ادب اطفال کی تخلیق میں بچوں کی مختلف عمر کے مدارج کا خاص خیال رکھا جائے، اور کہا بھی جاتا ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھتے وقت مصنفین کو ان کی عمر کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

(۲) ادب اطفال میں طوالت اور بے جا لفاظی سے پرہیز کیا جائے۔

(۳) بچوں پر تخلیق کار اپنی سوچ زبردستی قائم نہ کرے بلکہ اس طرح اپنی بات رکھے کہ بچہ اپنا فیصلہ خود لے۔

(۴) بچوں کے تخلیقی ادب میں سوال پیدا کرے تاکہ بچہ میں خود غور وفکر کی قوت پیدا ہو۔

(۵) تخلیقی ادب میں اچھے برے کا فیصلہ تخلیق کار خود نہ کرے نصیحت نہ کرے بلکہ ادب ایسا تخلیق کرے کہ بچہ صحیح غلط کا فیصلہ خود کرے۔

اس مختصر مضمون میں بچوں کی نفسیات کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنا اور ان پر تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں چند بنیادی سوال جو میرے ذہن میں ہیں وہ یہ کہ

(۱) اکیسویں صدی میں بچوں کی نفسیات میں کس طرح کی تبدیلی رونما ہو رہی ہے؟

(۲) اکیسویں صدی کے ادب اطفال میں کیا تبدیلیاں ہو رہی ہے؟

(۳) کیا ہمارے ادیب اکیسویں صدی کے بچوں کی بدلتی نفسیات کے مطابق ادب تخلیق کر رہے ہیں؟

(۴) اکیسویں صدی کے ادب اطفال میں کیا نئے موضوعات شامل ہیں؟

(۵) اکیسویں صدی کے ادب اطفال کو دلچسپ بنانے اور بچوں کو مطالعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کن باتوں پر زور دیا جا رہا ہیں؟

ان پر تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن طوالت کے ڈر سے میں اپنی باتوں کا اختتام انھیں سوالوں پر کرنا چاہونگی۔

•••

اردو کے اخبارات، رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھنا نیز اردو کی خدمت و اردو کے فروغ میں اپنا تعاون دینا عبادت ہے۔ جس پر عمل کرنا ہماری ذمہ داری ہے

........ماہنامہ ''کتاب'' کا الوداعی.........بقیہ صفحہ ۱۵ کا

اس لیے بہت سی کوششوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کوشش ہر اردو داں کو کرنی چاہیے کہ وہ ایک معمولی سی رقم رسائل اور کتب کی خریداری پر بھی خرچ کرنے کا مزاج بنائے۔ اگر ہم ہر ماہ ایک سے دو سو روپے کی قربانی اردو کے لیے دینے کا تہیہ کر لیں تو انشاء اللہ اردو اخبارات رسائل کی اشاعت کو فروغ کے ساتھ استحکام بھی نصیب ہوگا۔

''کتاب'' لکھنؤ کا اجرا اور ۱۲ برس کے بعد اس کی اشاعت کا بند ہو جانا بھی ایک معمولی واقعہ لگتا ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کی اشاعت کا بند ہو جانا اردو کی معیاری ادبی صحافت کا ایک المیہ محسوس ہوتا ہے۔ جس آب و تاب اور معیار کے ساتھ اس کی اشاعت ہوتی تھی اور ادبی حلقوں کو اس کی اشاعت کا جب انتظار رہتا تھا اس کو دیکھتے ہوئے اس کو جاری رہنا چاہیے تھا مگر ہم اردو والوں کی اس بے حسی کو کون سا نام دیا جائے کہ جو ایک موقر اور معیاری ادبی رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی رقم کا آکسیجن فراہم نہ کرا سکے اور جولائی ۱۹۷۵ء الوداعی شمارے کے ساتھ اس نے آخری سانس لی۔ میں الفاظ کی تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ''کتاب'' کے لیے بھی وہی جملے لکھ رہا ہوں جو ڈاکٹر اعجاز حسین کے لیے ''اداریہ'' میں لکھے گئے:

''کتاب'' کا شمار اردو کے ان جرائد میں ہوتا ہے جس نے ایک ادبی نسل کی تربیت کی ہے۔ علم و ادب سنجیدہ قارئین ''کتاب'' لکھنؤ کی فائلوں سے ایک عرصہ تک بصیرت حاصل کرتے رہیں گے۔''

•••

سماجی رزمیہ - ''لفظوں کا لہو''

ابراہیم افسر
مہپا چوراہا، سیوال خاص میرٹھ
موبائل نمبر 9897012528

ناول ''لفظوں کا لہو'' جواں سال افسانہ نگار اور ناول نگار سلمان عبد الصمد کا پہلا تجرباتی ناول ہے۔ اس ناول کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اشاعت اول جولائی 2016 کے محض آٹھ مہینوں کے بعد یعنی فروری 2017 میں اس کا دوسرا اڈیشن بازار میں آیا۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ قارئین اور ناقدین دونوں نے اس ناول کا نہ صرف بغور مطالعہ کیا بل کہ اسے دادِ تحسین بھی خوب عطا کی۔ ناول نگار نے ابھی اپنی زندگی کی صرف اٹھائس بہاریں ہی دیکھیں ہیں لیکن فنی پختگی کا یہ عالم ہے کہ ان کی تحریریں انھیں 60 سال کا ایک معمر اور تجربے کار ناول نگار کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ سلمان عبد الصمد نے اپنے ذاتی تجربات کو اس ناول میں خوب جگہ دی ہے۔ کیوں کہ ناول کا موضوع صحافت، صحافی اور صحافتی گھرانے ہیں۔ دور جدید میں صحافتی زندگی کتنی مشکل ترین ہوتی جا رہی ہے اس کا اندازہ ناول کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کام کرتے وقت ایک صحافی کو کن مسائل سے روبرو ہونا پڑتا ہے اور جو خبر ایک صحافی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر لاتا ہے اسے مدیر اخبار اپنی بے اعتنائی کی وجہ سے ردی کے ٹوکرے میں ڈال دیتا ہے۔ صحافت میں عورتوں کا کام کرنا بھی ایک چیلینج ہی ہے۔ قدم قدم پر انھیں استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے جائز حقوق کو بھی سلب کر لیا جاتا ہے۔ ایسی صحافت کو اگر مشروط صحافت کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ناول میں خانگی زندگی میں پھیلی کڑواہٹ اور رشتوں میں آئی دراڑ سے ٹوٹتے رشتوں کا بیان سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیمی، اقتصادی اور جسمانی مسائل کو خوب صورت اور سلیقگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جب ناول کی ورق گردانی کی جاتی ہے تو کہیں کہیں شہوت کے ایسے جلوے بھی نمودار ہوتے ہیں جن کے احساس سے ہی قاری جنسی لاابالی پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے بڑے لوگوں (جو سماج میں اشراف طبقہ ہے) کی اجلی دنیا کے کالے سچ بھی قاری کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ یقیناً یہ ناول سچی باتوں کی روداد ہے۔ ناول کی ورق گردانی کرتے کرتے کہیں کہیں ایسا احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات صفحۂ قرطاس پر نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اصل زندگی کی روداد کا حصہ ہیں۔

ناول کی قرآت کے وقت قاری کا یہی احساس سلمان عبد الصمد اور ''لفظوں کا لہو'' دونوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ موصوف نے نئے لکھنے والوں میں اپنا علاحدہ مقام و مرتبہ بنا لیا ہے۔ موصوف سوشل سائٹس پر بھی اپنی حاضری بنائے ہوئے ہیں۔ عالمی افسانہ فورم میں ان کے افسانے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ناقدین ادب نے بھی ان کی آواز کو غور سے سنا ہے۔ نفسیات پر بات کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ اپنے ناول ''لفظوں کا لہو'' میں بھی موصوف نے کرداروں کی ذہنی نفسیات پر خوب بحث کی ہے۔ ایک عورت جب اپنے شوہر سے live گفتگو کرتی ہے تو اس کے ابھرنے والے جسمانی اور نفسیاتی جذبات کو ہمدردانہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ جب محسن کو مدیر اخبار اپنے حساب سے رپورٹ بنانے کو کہتا ہے تو محسن کے دماغ میں اُٹھنے والے نفسیاتی طوفان کا نفسیاتی جائزہ ناول نگار نے پیش کیا ہے۔ نائلہ اور زنیرہ کے رشتوں کو سمجھانے کے لیے ناول نگار نے نفسیاتی تانا بانا اس طرح تیار کیا کہ قاری کو دونوں ہی کرداروں سے نفسیاتی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر رستوگی خود کی نفسیاتی پیاس بجھانے کے لیے ایک

ایسا چیمبر تیار کراتا ہے جس میں صرف اور صرف ذہنی سکون مل سکے۔اس طرح ناول نگار نے سماجی، خانگی اور صحافتی رشتوں میں نفسیات کی چاشنی کا رس گھولا ہے۔ یہ ملغوبہ اتنا میٹھا اور شیریں ہوتا ہے کہ قاری نے اسے کب نوش کرلیا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اگر میں یہ لکھوں کہ ناول نگار نے قاری کی نفسیات کو بھی اپنے قابو میں رکھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ناول کا مطالعہ اگر نفسیاتی طور پر بھی کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

ناول تین حصوں پر مشتمل ہے۔اور یہ تین حصے 27 ابواب میں منقسم ہیں۔ حصہ اول کے پہلے باب کا پہلا ہی جملہ لفظوں کی آزادی کی مانگ کرتا ہے۔ قاری جب مزید آگے بڑھتا ہے تو اسے جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں ہوئے سانحہ کی یاد آجاتی ہے اس زمانے میں جہاں تمام طرح کی آزادی کی مانگ کی گئی تو اس میں لفظوں کی آزادی چاہنے والوں، مطالبہ کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی تھی۔ پورا ناول تین کرداروں زنیرا، نائلہ (دونوں سوتن) اور محسن کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔اس ناول میں زنیرا کا کردار ایک بانجھ عورت کا جو ماں نہ بن پانے کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے اور نائلہ ایک خود مختار اور مضبوط عورت کے کردار کی مالک ہے۔ محسن اپنی دونوں بیویوں کے جھگڑوں اور اپنی صحافتی زندگی میں آزادانہ طور سے کام نہ کرنے دینے کی وجہ سے، تنگ آکر اپنا ملک ہندوستان چھوڑ کر سعودی عرب جا کر روزی روٹی کمانے والے انسان کی نمائندگی کرتا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ خود مختاری اور لفظوں کی آزادی، لکھنے کی آزادی، بولنے، سوچنے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کی آزادی کا خوب تذکرہ ہے۔ جب محسن اکمل خان کے اخبار میں کام کرتے ہوئے اپنے آپ کو بے بس مجبور اور لاچار پاتا ہے تو اس ہیجان سے باہر نکالنے کے لیے اس کی بیوی نائلہ اسے جو صحافتی درس دیتی ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ اسے انسانیت، قوانین اور مساوات کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"لفظوں کا لہو جب بہ نکلتا ہے تو آسمان کانپ جاتا ہے۔
لفظوں کا لہو جب بہ نکلتا ہے تو زمین کانپ اُٹھتی ہے۔
لفظوں کا لہو جب بہ نکلتا ہے تو ناانصافی کا شیطان پیدا ہوتا ہے۔
لفظوں کا لہو جب بہ نکلتا ہے تو انسانیت شرم سار ہو جاتی ہے۔
لفظوں کا لہو جب بہ نکلتا ہے تو آئین و قوانین مرنے لگتے ہیں۔
اگر صحافی بھی لفظوں کے لہو کا پیاسا ہو جائے تو........؟"

(ناول لفظوں کا لہو، صفحہ 73)

اسی کیفیت میں جب محسن ہندوستان چھوڑ کر سعودی عرب کام کی تلاش میں چلا جاتا ہے تو نائلہ کا کردار اور مضبوط ہو کر قاری کے سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب محسن سعودی عرب میں ذریعۂ معاش تلاش کر رہا ہے تو اس سے روزانہ اپنے دل کے جذبات کو شیئر کرنا اور دوسرے محسن کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کے کمزور شانوں پر ہے۔۔ نائلہ جو موڈرن تعلیم لیے ہوئے ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی سوتن زنیرا اس کی آزادی اور کام کرنے کے انداز میں کوئی دخل اندازی نہ کرے لیکن محسن کے سعودی عرب چلے جانے سے وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ لیکن زنیرا کو رات کے وقت دیکھ کر اس کے جسم یا یوں کہیے کہ زنیرا اور نائلہ دونوں کے جسم محسن کی جدائی کو برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔ دونوں جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کا سہارا بھی سمجھ بیٹھتی ہیں۔ یہاں قاری کے ذہن میں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ یہ دونوں سوتنیں جو ایک دوسرے کو پھوٹی آنکھ نہیں سہاتی وہ رات کے وقت ایک دوسرے کو جنسی ضرورت کا سامان کیوں کر سمجھ لیتی ہیں۔ البتہ ناول نگار یہ سمجھانے میں ضرور کامیاب ہو گیا ہے ہے کہ مرد اور عورت کی جدائی کا المیہ کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن نائلہ فیس بک پر روزانہ اپنے دل کی باتوں کو محسن سے شیئر کرتی ہے۔ لیکن زنیرا جوان باتوں سے ناواقف ہے وہ اپنے دل کے جذبات کس سے کہے؟ اس مسئلے کو سلمان عبدالصمد نے ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ ناول میں کئی ضمنی کہانیاں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ نائلہ بھی اپنی تحریریں اخبارات میں شائع کرانے کی جستجو میں رہتی ہے۔ اس کے سامنے محسن کے ادھورے خوابوں کو پورا کرنے کا نصب العین بھی ہے۔ وہ اخبار میں رپورٹنگ کا کام بھی کرتی ہے۔ وہ افسانے بھی لکھتی ہے۔ باہر کی دنیا کے مکر و فریب کو اپنی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ حتیٰ کہ نائلہ کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو زمانے کو اپنی مٹھی میں کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی وہ محسن کے لمس کو اس وقت محسوس کرتی ہے جب کوئی اسے جانے انجانے میں چھو لیتا ہے۔ جب نائلہ اپنے کام یعنی صحافت سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں کر پاتی تو وہ ایک نرسنگ ہوم میں کام کرنے چلی جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات نیلا پاسوان نرس سے ہو جاتی ہے۔ دونوں اسپتال کے گورکھ دھندوں کو اجاگر کرنا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر رستوگی جو اس اسپتال کا ہیڈ ہے، اپنے رنگین کمرے میں اپنے ذہن اور بدن کی تکان اتارنے کے لیے اپنی ملازمین کا ہی استعمال کرتا ہے۔ لیکن نائلہ کا ہاتھ جب ڈاکٹر رستوگی کے ہاتھ سے چھو جاتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی نسائی حرارت اُبال لینے لگتی ہے۔ محسن کی اسے بے تحاشہ یاد آنے لگتی ہے۔ ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ نیلا پاسوان ہی داکٹر رستوگی کو اس کے چیمبر سے رنگے ہاتھوں پکڑوا دیتی ہے۔

لیکن نیلا پاسوان اور نائلہ کے اذہان میں عورتوں کے حقوق کی بازیابی کی نئی نئی پلاننگ رہتی تھیں۔ ان دونوں کا ماننا تھا کہ معاشرے میں ترقی کے زینے پر قدم رکھنے کے لیے عورتوں کو ہی کیوں قربانی دینی ہوتی ہے۔ سلگتے ہوئے سماجی مسائل پر دونوں کے مابین کھُل کر بحث ہوتی ہے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ عورت ہی عورت کے مسائل کو بہتر طریقے سے محسوس کرتی ہے۔ نائلہ نے فرصت کے اوقات میں ایک کہانی بھی لکھی جس میں اس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جب تک عورت ہی عورت کی بھلائی اور اس کی فلاح اور بہبود کے لیے غور و فکر نہیں کرے گی تب تک سماج میں تبدیلی ممکن نہیں۔ اپنے انہیں خیالات سے متاثر ہو کر نائلہ نے اپنے ہونے والے بچے کو زنیرا کی گود میں ڈال دیا تھا، تاکہ زنیرا کی سونی گود میں خوشیاں آجائیں۔ محسن کی وطن واپسی کے بعد زنیرا، نائلہ او نیلا پاسوان اپنے آبائی گاؤں اور صوبہ بہار کی تعمیر و ترقی کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ سوال اُٹھانا بھی لازمی ہے کہ ناول کے زیادہ تر کردار بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ناول نگار کا آبائی وطن بہار ہی ہے۔ موصوف دہلی میں ایک عرصے سے مقیم ہیں، دہلی کی آب و ہوا سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ بہار کے مسائل سے واقفیت کی وجہ سے ممکن ہے کردار کا انتخاب بہار کی سرزمین سے ہی کیا گیا ہو۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو میٹروپولیٹن شہروں میں بھی عورتوں اور بالخصوص چھوٹے شہروں سے آکر بڑے شہروں میں زندگی کے ساتھ قدم تال کرنا ایک مشکل عمل ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے خانگی مسائل کے ساتھ معاشی پریشانیاں بھی درپیش رہتی ہیں۔

پورے ناول میں سلمان عبدالصمد نے سماجی مسائل کو مدنظر رکھا ہے۔ گویا ناول نگار نے معاشرے کی بدحالی کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ موصوف نے کئی تیکھے اور چبھتے ہوئے سوال قاری کے سامنے اپنے کرداروں سے کرائے ہیں، تاکہ ان سوالات سے قارئین غور و فکر کرنے پر مجبور ہوں۔ جدید ٹکنالوجی سے فیضان حاصل کرنا کوئی جرم نہیں اگر اس کا استعمال قاعدے اور اصول کے تحت کیا جائے۔ سلمان عبدالصمد نے نائلہ کے کردار کو آگے کر عالموں اور فاضلوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کئی ایسے سوال بھی قائم کیے جن کا تعلق عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق سے ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے مسئلہ پر جب نائلہ محسن سے گفتگو کرتی ہے تو اس کے دماغ میں صرف اور صرف زنیرا کا چہرا ہوتا ہے۔ وہ سوالیہ انداز میں محسن سے سوال کرتی ہے:

"مفتیوں کی رگِ فتوے کیوں پھڑک اُٹھتی ہے؟
ایک ہی مسئلہ پر اختلاف کیوں ہوتا ہے؟
عوام میں اپنی اپنی دھاک جمانے کے لیے؟
اپنے علم کا لوہا منوانے کے لیے؟
اپنی انا کی تسکین کے لیے؟
اپنے فتووں کی بنیاد پر ٹولی تیار کرنے کے لیے؟
ان سوالات اور نئے انکشافات کے متعلق سوچنے کی وجہ سے نائلہ آج کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ کوئی کل سکون نہیں مل پا رہا تھا۔"

(ناول لفظوں کا لہو، صفحہ 149)

اس طرح ناول نگار نے سماجی مسائل کے رزمیے کو سامنے رکھ کر ناول کا تانا بانا تیار کیا۔ آخر میں میں اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ قابل مبارک باد ہیں سلمان عبدالصمد صاحب جنھوں نے اپنی تخلیقی اور ادبی بصیرت کے جلوے ناول میں جگہ جگہ دکھائے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں موصوف نئی نسل کے نمایندگی کرتے ہوئے آگے بھی دوسری تخلیقات میں ان کے مسائل کو مدنظر رکھیں گے۔

•••

کرما

احمد رشید (علیگ)

گلی رہنٹ والا کنواں، سرائے رحمٰن علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

09897411153

اس نے رات آنکھوں میں کاٹ دی اور معمول سے پہلے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس لیے بیلوں کی گھنٹیوں کی سریل ٹن ٹن، نہ کسانوں کے ہانکنے کی آواز سنی۔ ایک پر اسرار سناٹا اس کے دماغ میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نگاہیں آسمان کی جانب اٹھائیں سوچنے لگا یہ ستاروں کا جال اسی وقت زمین پر زمین عذاب بن کر گرے گا جب بھی کشش کا عمل ڈھیلا ہو جائے گا۔ بچپن میں کسان اور سات بیٹوں کی کہانی پڑھی تھی۔ اس کہانی کا مطلب اس وقت سمجھ میں آیا جب ہماری دھرتی پر گدھوں نے پنجے گاڑ دئے۔ گاؤں کے بچہ بچہ نے ایک جٹ ہو کر نہ صرف پنجے اکھاڑ پھینکے بلکہ آنکھیں پھوڑ دیں کہ مٹی پر کوئی بری نظر نہ ڈالے۔ آج سے چندروز پہلے کی بات ہے گاؤں کی جانب آنے والی ایک سڑک کے دائیں طرف ایک پیاؤ بنائی گئی اور اس پر ایک لمبا چوڑا یادگار پتھر لگانے کے لیے سب نے مل کر ''ہے شا'' کر کے اٹھایا... ''ہے شا'' میں کتنی طاقت ہے کہ پتھر موم بن کر جیسے پیاؤ میں اپنے آپ چپک گیا ہو... آسمان پر اس کی نگاہیں اس ستارہ کی تلاش میں اٹھ گئیں جس کی تابندگی سے ایسی روشنی عطا ہو جو ذہن کو منور کر دے۔ وہ سوچتا ہے سورج نکلے گا چوپال میں پورا گاؤں جمع ہو گا۔ وہ سرپنچ کی کرسی پر بیٹھے گا۔ عدل کرے گا..... اسے یاد آیا مولوی صاحب کہتے تھے جو انصاف پسند ہوتے ہیں وہ اللہ کے بہت نزدیک ہوتے ہیں۔۔ اور یہ کہتے کہتے وہ اللہ کے نزدیک ہو گئے ... جو کچھ میں اب ہوں انہیں کی وجہ سے ہوں۔ یہ انصاف کی کرسی مجھے ان سے وراثت میں ملی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے... تم دو دن کے ہو گے۔ گاؤں کی ندی کے گھاٹ پر پائے گئے تھے تمہارے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اور آنکھیں ابھرتے سورج پہ مرکوز تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو خدا کا کرشمہ جان کر گلے سے لگا لیا۔۔۔ اور تمہارا نام کرامت رکھا۔ اس نے اپنی سوچ کو جھٹکا دیا''

کرامت سے کراما... اور اب مخفف ہو کر کرما ہو گیا۔

جوں جوں سیاہی ہلکی ہوئی تک تک تک... اہے... اہے... ہے... آہ... آہاہاہا... اور ٹن ٹن کی ملی جلی آوازیں رس گھولنے کے بجائے اس کے کانوں میں وِش گھول رہی تھیں وہ سوچتا ہے وِش تو پورے گاؤں کے جسم میں سرائیت کر گیا ہے۔ لگتا ہے گدھ تو چلے گئے مگر ان کے زہریلے ناخون جسموں میں ٹوٹ گئے..... جو زخم بن کر آہستہ آہستہ ناسور بن گیے ... جو تمام رگوں میں خون کے بجائے زہر کے مانند رقص کر رہا ہے... پھر اس کا علاج کون کرے؟ اور اگر کرے تو بیچارے گاندھی کی طرح گولی کھائے... گاندھی کی طرح گولی کھائے... گاندھی جی خون کے خلاف برت رکھتے نہ ہی خونم خون ہوتے اس کو یاد آیا مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ شہید کبھی نہیں مرتے ناتھورام بیچارے نے خواہ مخواہ خون میں ہاتھ رنگے۔ گاندھی جی تو امر ہو گئے... میں بھی انصاف کروں گا... میں امر ہو جاؤں گا... چاہے میری قوم عیسیٰ کی طرح پھانسی پر کیوں نہ لٹکا دے؟ وہ چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر نظر اٹھائی۔ ستاروں کو گنا ان کی تعداد گھٹ رہی تھی، لوٹا اٹھایا، جنگل کی طرف چل دیا۔ گاؤں میں چکیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، دور کہیں پن چکی کی آواز پھک پھک کر رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ، بیلوں کی ٹن ٹن۔ کسانوں کی ہانک ... یہ تمام آوازیں مل کر اس کے ذہن میں جھنجھناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ وہ سوچتا ہے ہمارے گاؤں میں کثیر آبادی ٹھاکروں کی ہے ان کی بیگاری کرنے کے لیے چمار، بھنگی اور دیگر برادریاں بھی ہیں کچھ بٹائی پر کھیت جوتنے والے مسلمان بھی ہیں۔ سب ہی گاؤں میں مل جل کر رہتے تھے۔ رہتے تو اب بھی ہیں؟ مولوی صاحب کہا کرتے تھے'' کرما جب تو سات سال کا تھا گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک چلائی اور سوراج کا اعلان کیا سب ہی نے مل کر جے جے کار کی بلند آواز لگائی

اس کی آواز سے آسمان گونج اٹھا اور زمین پر آسیب بن کر منڈلانے لگی غیر ملکی گھبرا گئے .... سانپ چلے گئے زہر چھوڑ گئے ... وہ سوچتا ہے بچپن میں لوگ مجھے دیکھ کر منھ پھیر لیا کرتے... عورتیں کانا پھوسی کرتیں جانے کس کا پاپ ہے...؟ مگر ہے بڑا ملوک... ''ملوک'' اور ''پاپ'' کے معنی مولوی صاحب نے سمجھائے... حساب پڑھاتے وقت بولے جب بھی دو گنتیاں آپس میں ضرب کی جاتی ہیں تب حاصل ضرب تیسری گنتی آتی ہے.... وہ سوچتا ہے بچہ جب حاصل ضرب ہوتا ہے تو حرامی کیسے ہو گیا؟ اجابت سے فارغ ہو کر ندی پر وضو کیا، فجر کی نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مولوی صاحب کہا کرتے تھے خدا کے ہم معذور اور مجبور بندے ہیں مانگنا اللہ کو بہت پسند ہے..... آنکھیں بند کیں... ''اے خدا تو منصف ہے انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے...... مگر انصاف تو تو نے بھی نہیں کیا، کوئی کالا کوئی گورا، کوئی چھوٹا کوئی بڑا.... لاحول ولاقوۃ اور خیال کو جھٹک دیا... نہیں... نہیں... تو عادل ہے... تیری مصلحت تو ہی جانے .... ایک پر اسرار روشنی سی دماغ میں کوندی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں... پو پھٹ رہی تھی.... سورج دیوتا آسمان کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا مولوی صاحب سے سنا تھا آزادی سے پہلے گاؤں میں ایک مندر تعمیر ہو رہا تھا۔ معمار کلوا چمار تھا اور مزدور زیادہ تر مسلمان تھے... جب مندر مکمل ہو گیا مٹرو نے بھگوان کرشن کی آکرتی [1] ایک پتھر سے کاٹی ... وہ آکرتی کیا تھی سوئیں [2] بھگوان کرشن تھے ... مورتی سنگتراشی کا بولتا نمونہ تھی مانو مرلی والے کی آتما سما گئی ہو۔ کپکپاتے ہونٹ بولنے کے لیے بے چین۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنا چاہتے۔ جب وہی مورتی مندر میں ویدک منتروں دوارا پرن پرتشٹھا [3] کی گئی۔ مندر میں جاگرن ہوا۔ لیکن پنڈتوں نے چماروں اور ہریجنوں کو مندر میں داخلہ پر ممانعت لگا دی گاؤں میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ مٹرو کا دعویٰ تھا'' جس بھگوان کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اس کے درشن کرنے کے لیے مجھے روک دیا گیا'' مولوی صاحب نے مٹرو کے آنسوؤں کو محسوس کیا لوگوں کو سمجھایا بجھایا گاندھی جی کے آدرشوں کا واسطہ دیا'' اس میں جن کا کیا قصور؟ یہ تو بھگوان کا قصور ہے کہ اس نے جَن کو کہاں جنم دیا''؟

''بے شک'' گاندھی جی ہریجنوں کی بستی میں جاتے ہیں ان کی سیوا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ پرنتو وہ اپنی بکری کا دودھ پیتے ہیں'' ایسی بات کنہیا نے مولوی صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہی۔

لوگ ہنسنے لگے تھے، مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکلا۔ آخر کار تاریخ کا سیاہ ورق لکھا گیا... آزادی کا لطف اٹھانے سے پہلے گاندھی جی کے گولی لگی... مندر بھی مکمل ہوا مورتی بنانے والوں کو پوجا کرنے کا حق نہیں ملا۔ پھر دوسرا مندر تعمیر ہوا۔ مٹرو نے کرشن مورتی بنائی مندر میں لگائی گئی۔ اب گاؤں میں ٹھاکروں کا مندر ہے، ایک چماروں کا۔ بھگوان ان دونوں میں ایک ہی ہے۔

وہ اٹھا ندی کے کنارے کنارے چل دیا۔ اس پگڈنڈی کی طرف مُڑ گیا جو ہنومان اکھاڑے تک جاتی ہے۔ تیل مالش کی اور جگبیر سنگھ کے ساتھ زور کیا جب دونوں تھک گئے۔ نہائے دھوئے... دونوں لنگوٹیا یار خاموشی سے کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

''یار کرما، آج تاو، بڑا کھاموش ہے، کیا بات ہے رے'' جگبیر نے کہا

''کچھ نہیں'' اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا

''نہ کچھو ہے زرور، ورنہ کھاموس ہونے کا مطبل''، جگبیر نے سنجیدگی سے دریافت کیا

''میں چنتا کے مارے رات بھر سویا نہیں۔ گاؤں میں بے مطبل جو ہنگامہ ہو گیا ہے''

''ہاں تو کیا ہوا... تجھے کاہے کا ڈر ہے... تو تو ہنومان کا بھگت ہے رے''، جگبیر نے کہا

''بات یہ نہیں ہے... ڈر یہ ہے کہ گاؤں میں فساد نہ ہو جائے .... جو لوگ پریم کی مالا میں گُندھے ہیں کہیں بکھر نہ جائیں'' اس نے نامعلوم شک کا اظہار کیا

''بھئی کرما... جس استھان پر مسلمان مسجد بنانا چاہتے ہیں وہ ہندوؤں کی ہو یا نہ ہو مسلمان کی نہیں ہے''

''ہاں ٹھیک ہے'' یہ کہہ کر کرما کھڑا ہو گیا

کرما گھر کی طرف چلنے لگا۔ اسے زمین گھومتی ہوئی نظر آئی جیسے نشہ کر لیا ہو۔ جیسے تیسے گھر پہونچا اس نے مٹھے میں باجرہ کی روٹی میٹری، نمک مرچ ملائی... اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی... گاؤں میں چہل پہل بڑھ رہی تھی۔ گاؤں کا بچہ بچہ

چوپال کی طرف جا رہا تھا... کرما بھی چلنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ ذہن میں مختلف سوالات تھے۔ لیکن جوابات نہیں تھے۔ وہ سوچتا ہے مولوی صاحب کہتے تھے جس سوال کا کوئی جواب نہ ہو... اس پر غور کرنا فضول ہے... خدا کیا ہے؟... انسان کیا ہے؟... زندگی کیا ہے؟... موت کیوں ہے؟ فرمانِ خداوندی ہے "تم صرف اتنا ہی جانتے ہو جتنا ہم نے تم کو علم دیا ہے... اس سے آگے سوچ و فکر بے کار ہے" اس نے اپنی سوچ کو جھٹکا دیا... تیز تیز قدم بڑھائے... چوپال پر جم غفیر تھا... مرد بیٹھے تھے ایک جانب عورتیں کھڑی تھیں، بچے چاروں طرف کھڑے تھے۔

کرما چبوترے پر بیٹھ گیا... دونوں فرقوں کی بات بغور سنی، بحث و مباحثہ ہوا۔ اس وقت کرما سوچ رہا تھا اگر میں نے انصاف نہیں کیا تو گاؤں میں آگ لگ جائے گی ہری بھری کھیتیاں جل جائیں گی۔ مکانات جل جائیں گے۔ فیصلہ کسی ایک فرقہ کے خلاف جائے گا وہ فرقہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ میری چاروں طرف بدنامی ہو جائے گا۔ میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا۔ لوگ میرے فیصلہ کا رشتہ میرے جنم سے جوڑیں گے... کوئی کہے گا تخم خراب ہے... کوئی حرامی ہے۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا؟

چوپال میں سلگتا ہوا منظر تھا... چہ می گوئیاں چاروں طرف ہو رہی تھیں۔ مندر بنے گا اور کوئی کہہ رہا تھا یہاں مسجد بنے گی۔ بس فیصلہ کا انتظار ہے... فیصلہ نہ کیا گیا تو زبردست جھگڑا ہو جائے گا... لیکن کیا... فیصلہ کرنے کے بعد جھگڑا نہ ہو اس کی کیا ضمانت ہے؟ وہ اسی سوچ و فکر میں غلطاں تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی، کرما نیائے کرو" دوسری طرف سے آواز آئی، کرما انصاف کرو"

وہ چبوترے پر چونک کر کھڑا ہو گیا... چاروں اطراف و جوانب نظر اٹھائی اس نے سب کو خاموش کیا... "بھائیو میں نے بہت غور و فکر کیا اور میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں "گھیری ہوئی زمین پر مسجد نہیں بن سکتی"

اس فیصلے سے مسلمانوں کے چہرے اتر گئے... ہندوؤں نے کرما کو گود میں اٹھا لیا۔ جگبیر نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

کچھ عرصہ بعد تمام لوگ اس واقعہ کو بھول گئے.. گاؤں کا ماحول پُر سکون تھا... ہر شخص خوش تھا... آسمان پر مطلع صاف تھا... کھیتیاں سبز پوشاک پہنے رقص کر رہی تھیں... ندی کے پانی کی ہلکی دھُن پر پرندے گنگنا رہے تھ... فضا پر لطف تھی... قریب کے گاؤں میں نوٹنگی دیکھنے جانے کی تیاری میں پروا گاؤں مصروف تھا... بیل گاڑیوں میں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی کو کرما ہانک رہا تھا... دوسری کو فلکبیر... دونوں بیل گاڑیوں میں دوڑ ہو گئی... کرما کی بیل گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا... اچانک گاڑی کا اک پہیہ نکل جانے سے گاڑی الٹ گئی۔ کرما گاڑی کی لپیٹ میں آکر بُری طرح زخمی ہو گیا۔ پیر کچل گئے۔ سر میں سخت چوٹ آئی.. اس کے اوپر بے ہوشی طاری ہو گئی... خون مسلسل رس رہا تھا... اچانک کرما کا جسم مردہ ہو گیا... کرما کا جسم بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا... پورا ماحول ماتم میں ڈوب گیا تھا... ایک طرف سے آواز آ رہی تھی "ہم کرما کو جلائیں گے"... دوسری طرف سے آواز آئی "ہم کرامت کو دفن کریں گے"

اُس جم غفیر میں ایک شور برپا تھا۔ پورے گاؤں میں افراتفری کا عالم تھا۔۔۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھوں میں لٹھ تھے... چاروں طرف قیامت کا سا ہنگامہ تھا... لٹھ ٹکرا رہے تھے... زمین سرخ ہو رہی تھی۔ سبز کھیتیاں کالی ہو رہی تھیں۔ انکھیں کھُلی تھیں جو آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

ایک جانب آنسوؤں میں ڈوبا جگبیر کھڑا تھا... ایک ہی سرعت میں وہ کرما کے مردہ جسم کے قریب آیا... اس نے کندھے پر پڑا کپڑا اتار کر اس کے چہرے پر ڈال دیا... لوگوں کی جانب مڑا کرما کہا کرتا تھا "کرم کرو مام اِچھت فلن"!... یہ کہہ کر ہاتھ میں لٹھ سنبھالا جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور خود بھی فساد میں شامل ہو گیا۔

•••

مشکواۃ

شمیم فاطمہ
سسوال سوان، بہار
موبائل نمبر 09696346197

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ سرتاقدم سیاہ پوش اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھی کالج میں "حقوق نسواں" سے متعلق بڑا پروگرام تھا۔ شہر کے مقتدار حضرات اور یونیورسٹی کے چانسلر صاحب بھی تشریف لانے والے تھے۔ سب سے ذہین اور فعال طالبہ ہونے کی وجہ سے تمام ذمہ داریوں کی نگاہبانی اسے سونپی گئی تھی۔ کالج میں آجتک کسی نے بھی اسکی شکل کسی نے نہیں دیکھی تھی اسکے نام کے علاوہ اسکی پہچان دو بے خوف آنکھیں اور دلیر لہجے سے تھی۔ اپنے کالج کی تمام تر سرگرمیوں میں وہ بھرپور حصہ لیتی تھی۔ کچھ طلباء کے بعد اسپیکر نے اسے آواز دی اور وہ اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ اسنے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔۔۔۔

حقوق نسواں کا استحصال مرد حضرات غیرت کے نام اور خود خواتین ایڈوانسنس کے نام پر کر رہی ہیں اگر سچائی کے ساتھ نسوانیت کو اسکے حقوق واگزار کرانے کی خواہش معاشرے میں ہو تو نوع بشر کے دونوں ہی طبقوں کو اپنے اندر موجود اس مخصوص جبلت کا عرفان حاصل کر کے اسکے صیحا ور برمحل استعمال کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔ جو قلب مشیت سے قلب انسانی میں منتقل ہوا ہے اور ہر طبقے میں عملی ضرورت کے اعتبار سے ظہور پزیر ہے۔

مردانہ طبقے میں اسکے غلط استعمال اور زنانہ طبقے میں اس سے لاعلمی کی بناء پر صرف نظر کے سبب تمام نظام درھم برھم ہے۔ اور استحصال کا ماحول پیدا ہوا ہے لہذٰا مرد حضرات میں غیرت جبروت مظہر الٰہی ہے۔ جسکا میدان عمل اپنے نفس پر قادر رہنا اور دوسروں تک انکے حقوق کا پہنچانا اور لوگوں کے لئے تحفظ کی فضا قائم کرنا ہے۔ خواتین میں حیا کی جبلت کا ظہور تحفظ عصمت کے تحت ہے۔ یہ سطح مشیت پر عدم رویت کی صورت میں پہچانا جاتا ہے دونوں اصناف اسکا غلط استعمال کر رہے ہیں اسی لئے غیرت کے نتجے مردوں سے بردباری اور شفقت کے بجائے جلد بازی اور سختی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ظلم کے زمرے میں آجاتا ہے، اور عورتوں سے حیا کے نتیجے میں بجائے دلیری اور ثابت قدمی کے پسپائی اور بزدلی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی شمول ظلم ہے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور وہ مضمون ختم کر کے اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ انعامات کی تقسیم کے بعد وہ بھی اپنا انعام سنبھالے گھر جانے کے ارادے سے لائبریری سے اپنا دیگر سامان سمیٹ رہی تھی کہ لڑکیوں کی ایک ٹولی نے اسے گھیر لیا۔۔۔۔۔

کیا بات ہے دوستو آج گھراؤ کا ارادہ ہے کیا وہ محبت سے بولی

نہیں میڈم عالیہ نے کہا۔ ہم سب مبارکباد دینے کے لئے حاضر ہوئے ہیں

اچھا اچھا شکریہ بہنوں اسنے جھک کر سلام کیا اور آگے بڑھنا چاہا مگر زرین نے اسے بازو سے تھام کر روک لیا۔

سنو تم نے مردوں کے اعمال کو ظلم کہا وہ تو ٹھیک ہے بات سمجھ میں بھی آئی مگر عورتوں کو بھی ظالم بنا دیا خود اسی صنف سے تعلق رکھنے کے باوجود بھئی بھلا عورتیں کس پر ظلم کرتی ہیں۔

خود پر اسنے برجستہ جواب دیا

ظلم کے معنی مار پیٹ گالی گلوچ ہی نہیں ہے بلکہ کسی چیز کا غلط استعمال بھی ظلم ہے

زرین۔ اچھا تو خواتین کس چیز کا غلط استعمال کرتی ہیں؟

مشکواۃ۔خدا نے خواتین کو اپنی عصمت میں سے حصہ دیا ہے اور اسکے تحفظ کے لئے حیا عطا کی ہے جسکے صحیح استعمال سے جرأت اور بے نیازی کا اظہار صنف مخالف کے مقابلے میں ہونا چاہئے مگر غلط استعمال کی وجہ سے جلدی اثر پزیر ہو کر مرعوب جاتی اور جس سے بزدلی ظاہر ہوتی ہے اور یہی ظلم ہے۔۔

فرحانہ۔اچھا سنو عدم روایت تو خدا کی صفت ہے اس سے اور حیا سے کیا لینا دینا؟

مشکواۃ۔ذات الہیٰ کی عصمت مانتی ہو؟

فرحانہ ۔ ہاں بھئی ہم کیا سبھی مانتے ہیں ۔۔۔ بالکل بالکل

۔۔۔۔۔سب نے تائید کی

مشکواۃ۔صنف نسواں کی بھی عصمت مانتی ہو؟

فرحانہ۔ہاں پھر

مشکواۃ۔ پھر یہ کہ عصمت الہیٰ کے تحفظ کا ذریعہ عدم رویت ہے اور عصمت نسواں کے تحفظ کا ذریعہ حیا ہے ارے بیٹھ کر باتیں کرو و ورنہ دیکھنے والوں کو دنگے کا احساس ہوگا۔۔سب ہنستی ہوئی بیٹھ گئیں۔۔

مہر اور زیبا جو انکی جونیر تھیں آہستہ آہستہ قریب آئیں تو مشکواۃ نے انکے لئے بھی جگہ بنائی اور ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

آداب سینئرس دونوں یک زبان گویا ہوئیں۔۔۔

مشکواۃ۔آداب آداب کہو کچھ پوچھنا ہے؟

جی باجی یہ زیبا کہہ رہی تھی کہ حیا کا مطلب ہے کہ عورتیں گھر سے کہیں باہر نہ نکلا کریں کالج اسکول اور نوکری وغیرہ کے لئے کیا ہم اپنی تمام صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر گھر میں بند ہو جائیں تبھی حیا دار کہلائیں گی، ورنہ نہیں

مشکواۃ۔نہیں ہرگز نہیں گھر میں رہ کر بھی بے حیائی کی جا سکتی ہے اور باہر رہ کر بھی باحیا رہا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے اوپر ڈپنڈ کرتا ہے کہ ہم کس راہ کو اپناتے ہیں

حیا کا مطلب گھر میں رہنا یا اپنی صلاحیتوں کو مار دینا ہرگز نہیں ہے۔حیا کا مطلب ہے بہادر خدار ہنا اور صنف مخالف کی دعوت نظر سے یکثر بے نیاز رہنا

اور اور نقاب پہننا ؟زیبا نے جلدی سے پوچھا

مشکواۃ۔ کھلے چہرے کے ساتھ شہوت پسند مردوں کی نگاہ سے بچنا اور نظر انداز کرنا دونو کام مشکل ہے اور نقاب پہن کر ہم با آسانہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ جب ہماری عمر اور تجربہ ہمارے اندر اتنی متانت پیدا کر دیتے ہیں کہ شخصیت بارعب ہو جائے اور نگاہ میں صنف مخالف کو و محدود کر دینے کی صلاحیت آجائے تو تب نقاب چنداں ضروری بھی رہ جاتا۔اسی لئے ۸۰۔۸۵سال کی عورتوں پر پردہ ساقط ہو جاتا۔

کیا تو ہم بھی نقاب پہن کر آیا کریں۔مہر نے پوچھا؟

مشکواۃ۔بہتر تو یہی ہے کیا تم بے نقاب رہ کر بازاروں اور کالج میں الجھن نہیں محسوس کرتی ؟

زیبا۔بازار تو خیر بازار ہے کالج میں خاص الجھن نہیں ہوتی مگر کچھ لوگ ،،،،،،،،،، اسنے جملہ ادھرا چھوڑ دیا اور دروازے کے قریب کھڑے اک مکس گروپ کی طرف دیکھا نیاز اور اسکے ساتھی نہ جانے کس انتظار میں ابتک کھڑے تھے

اچھا سینیر ز ہم چلتے ہیں خدا حافظ سلام کرتی ہوئی دونوں دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

نیاز نے درمیان میں دونو کا راستہ روک لیا محترمہ نے ہاتھ پکڑا تھا لاؤ چوم لوں اسنے بیہودہ لہجہ میں کہا

مشکواۃ جلدی سے انعامات کے پیکٹ اور شولڈر بیگ اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی نیاز دروازہ چھوڑ کر ہٹ گیا

آرہی ہیں محترمہ حیا صاحبہ اسٹائیلش اور نیم عریاں لباس میں ملبوس روبی نے دانت کچکچائے

نیاز ایک ہاتھ سینے پر رکھکر روبی کے سامنے خم ہوا آنکھوں کو نشیلی اور لہجہ مخمور کرتے ہوئے بولا ہائے میری جان کامیابی کی مبارک باد تو قبول کرتی جاؤ۔۔۔

سلام عشق میری جان ذرا قبول کرلو

پیچھے کھڑے گروپ کے دیگر لڑکے لڑکیوں نے لہک کر ہانک لگائی

اتنی دیر میں اس سمیت سبھی لڑکیاں باہر نکل چکی تھیں آوارہ

قہقہوں کی آواز باہر تک آرہی تھی وہ اپنی ریسٹ پر نظر ڈالتی شام ہونے کے سبب تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھی تھی کہ آواز پر چونک گئی

پلیز محترمہ مشکواۃ صاحبہ پلیز بس دو منٹ

اسنے پلٹ کر دیکھا الگ تھلگ رہنے والا فیاض جو لڑکوں میں مغرور اور لڑکیوں میں مولوی صاحاب کے نام سے جانا جاتا تھا اور شاذ و نادر ہی کسی سے مخاطب ہوتا تھا لمبے لمبے ڈیگ بھرتا اسکی طرف آرہا تھا وہ ایک لمحہ کو گھبرا گئی مگر پھر خود کو سنبھال لیا اتنی دیر میں وہ بھی نزدیک آکر کھڑا ہو گیا تو اسنے مطمئین اور مستحکم لہجہ میں سوال کیا کیا بات ہے فیضان صاحب معاف کیجئے گا مشکواۃ اپنے مردوں کی غیر کو داخل ظلم کیا ہے ۔کیا غلط سے روکنا اور سہی پر برقرار رکھنے کی کوشش کرنا ظلم ہے وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا

مشکواۃ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وجیہ اور سنجیدہ چہرے پر پسینے کی نمی کوشش ضبط کی نشاندہی کرتھی میں نے اول تو یہ کہ غیرت کو نہیں بلکہ طریقہ اظہار غیرت کو ظلم کے زمرے میں داخل ہو جانے کی بات کی ہے ٹھرے ہوئے لہجہ میں بات ختم کر کے ایک طویل سانس لی اور پھر سلسلہ کلام جوڑا میں نے صرف اظہار غیرت کے غلط طریقے کو ہی نہیں بلکہ اظہار حیا کہ غلط طریقے کو بھی ظلم میں شامل کیا ہے

فیاض نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا اور بھڑکتی ہوئے لہجہ میں بولا نیم عریاں لباس آزادی کے نام پر بے راہ وروی علم کی آڑ میں اکسٹرا یڈوانسنس کیا گھر کی آبرو کو خاموشی سے فیشن اور موڈرن لائف اسٹائل کے دھارے میں بہتے دیکھتے رہنا چاہئے کیا مردوں کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی زبان کھولیں فیاض کی لہجہ کی تپش نے اسے اندر سے سلگا کر رکھ دیا مگر اسنے بڑے تحمل اور ضبط سے مصالحانہ انداز میں جواب دیا فیاض اگر گھر کے مردوں میں عرفاں غیرت اور عورتوں میں عرفاں حیا راسخ کر دیا جائے تو ہرگز گھر کی عزت کسی بڑے سیلاب میں نہیں بہہ سکتیں مغربیت اور فیشن کے معملولی دھارے کی کیا حثیت ۔اسنے اندر کی لہک اور اپنا تحمل برقرار رکھنے کے لیئے ایک سرد طویل سانس لی کیا میں دور حاضر کی لڑکی نہیں ہوں اور کیا میں تعلیم نہیں حاصل کر رہی ہوں اپنی ضرورتوں کے لئے باہر نہیں نکلتی اس نے ایک استفہامیہ نگاہ فیاض کے چہرے پر ڈالی

......میں عام لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں آپ اکسپشنل کیس ہیں۔

مشکواۃ۔اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میرے گھر کے مردوں کو غیرت کی حدود اور صحیح طریقہء اظہار معلوم ہے اور عورتوں کو حیا کی حدود درست طریقہ اظہار کی سمجھ ہے۔؟

اسکے سوالیہ لہجے نے فیاض کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو کسی حد تک نارمل کر دیا تھا، اس نے بھی مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے شدید ردعمل کا جواز پیش کیا ۔عورتوں میں ہوس اور خودنمائی کا جذبہ اسقدر شدید ہوتا ہے کہ و وہ اسکی رو میں بہہ کر سب بھول جاتی ہیں ایسے میں اگر محافظت کا ذمہ دار مرد اگر شدید رویہ اختیار کرتا ہے تو اسے ظلم کا نام نہیں دیا جانا چاہیے۔

مشکواۃ۔ خودنمائی کا جذبہ فیاض صاحب صرف عورتوں میں ہی نہیں مردوں میں بھی انتہائی شدید ہوتا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔اپنی ذات کا اظہار ہر فرد بشر چاہتا ہے اور خلقت کا بنیادی مقصد خالق کائینات نے بھی یہی فرمایا ہے

....میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں؛؛

تو پہچانے جانے کی خواہش وہ فطری امر ہے جسکے بغیر زندگی کا تصور محال ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کی خواتین کی نگاہوں سے انکی پہچان کے موارد کی معرفت گم ہوگئی ہے۔وہ غلط وسائل اور غلط موارد میں اپنی ذات کی پہچان تلاش کر رہی ہیں۔جسکے نتجے میں ان پر بے حیائی کا الزام ثابت ہو رہا ہے۔وہ بولتے بولتے ایکدم خاموش ہوگئی جیسے کچھ کہنے کو خود کو باز رکھ رہی ہو۔

فیاض ۔کیسے وسائل؟ اور کیوں کھو گئے؟ اسمیں قصور کس کا ہے؟ اسنے کئی سوال ایک سانس میں کر ڈالے۔

مشکواۃ۔ معاشرے کی تشکل فیاض صاحب آپ مردوں کے ہاتھ ہوتی ہے اور پچھلی ایک صدی سے آپنے زبان وعمل سے ایسے حالات پیدا کر دیے اور مسلسل یہ باور کرایا کہ عورت کے پاس اپنی مقصد برآوری کے لئے اپنا تشخص قائم کرنے کے لئے سوائے اس خاکی وفانی جسم کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے لہذٰ اسے صرف اور صرف اس پر توجہ

دینی چاہئے۔اور اسی صلاحیتوں کو بروئے کارلاکر وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہوسکتی ہے۔اب جبکہ وہ اس فن میں ماہر ہوگئی تو آپکی پیشانی پر غیرت کا پسنہ چمکنے لگا اسکا لہجہ دہکنے لگا تھا۔گم کردیا آپ لوگوں نے اسکی اعلیٰ و ارفع صلاحیتووں کو، جیسے خدا نے مردوں کو قوت فکر، فن تحریر، صلاحیت گفتار، ندرت خیال عطا کیا ہے اسی طرح سب کچھ ایک عورت کو بھی ودیعت کیا ہے۔

فیاض صاحب وہ بھی ایک مفکر کی طرح، ایک شاعر کی طرح ایک سائنس داں کی طرح، ایک ادیب کی طرح اپنا تشخص قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔آپ لوگوں نے اس پر باعزت تشخص کے تمام دروازے بند کئے اسے مبتذل ترین ذریعہ تشخص کی آشنائی دی اور اب آپ ہی شدید ردعمل کی بات کرتے ہیں اب آپکی غیرت جاگ رہی ہے۔وہ بھی نہ عالمی سطح پر نہ عوامی سطح پر بلکہ صرف اور صرف شخصی سطح پر۔ پرچوں کے سرورق اخلاق سوز اشتہار بیہودہ پوسٹر چھپواتے وقت یہ بھڑکتی ہوئی عزت کہاں سو جاتی ہے کیوں پیشانی پر پسنہ نہیں آتا معظم اور محترم صنف کی عریانی تصاویر سے لذت نظر کا سامان فراہم کیا جاتا اپ جیسے عزت دار مرد آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔اسکا جسم غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا کچھ دیر خاموش رہ کر وہ ہانپتی اواز میں بولی معاف کیجیے گا فیاض صاحب بہت دیر ہوگئی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ڈوبتی ہوئی زرد دھوپ گھر چلنے کا اشارہ کررہی تھی۔اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔۔ فیاض وہیں پر خاموش کھڑا رہا اور وہ اسکے پہلو سے تیزی سے نکلتی چلی گئی۔۔اپنے پیچھے غبار کا دھند چھوڑ گئی ۔۔اور وہ کچھ دیر دھند لکے میں کچھ تلاش کرتا رہا پھر سر کی ایک تفہیمی جنبش کے ساتھ بڑبڑایا۔۔۔۔۔۔شاید یہی میرا آئیڈل ہے۔

•••

سید کے دوہے

محمد مجاہد سید
جدہ

ظلم کی یوں آندھی چلی سب میں ہے آتنک
سب اپنی ہیں فکر میں راجا ہوں یا رنک

خون سے اپنے سن گی بستی کی سب دھول
پھر اس میں نکلے بہت رنگ برنگے پھول

خون کی بو پھیلی ہوئی ، ایسی بہے بیار
لوگوں کی مسکان میں جیسے تیز کٹار

••••••

یاد ہے اس کا بولنا ، مکھ کا سندر روپ
کہرے سے جیسے کھلے ، دھیرے ، دھیرے دھوپ

آنسو سے کاجل بہے، سب کو اس کی بوجھ
بہتے آنسو پونچھ دیں ، کس کی اتنی سوجھ

رہ رہ دمکے دامنی ، آنگن پڑے پھوار
گھر سونا ساجن بنا دل پر لگے کٹار

•••

......کہ جہاں مل گیا

ندیم راعی
۱۹۸، چودھری ہاؤس، گل شہید، مرادآباد۔۲۴۴۰۰۱
موبائل نمبر7394933343

سردیوں کی آمد آمد تھی، ہلکی پھلکی سرد ہواؤں نے موسم کو حسین بنا دیا تھا۔ایسا موسم جو انسان کے ذہن و دل کو مسحور کردیتا ہے۔اور اسے کائنات کی ہر شہ حسین نظر آتی ہے۔ان لمحات کو وہ قیمتی اثاثہ جان کر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتا ہے۔ایسی ہی ایک نہایت حسین دلکش و پر بہار صبح میں اپنے ایک دیرینہ دوست سنیل کے ساتھ الہ آباد جانے کے لئے کانپور گھنٹہ گھر بس اڈہ پہونچ گیا۔ہم دونوں الہ آباد جانے والی بس میں سوار ہوئے تو اس میں صرف دو سیٹیں خالی تھیں۔ایک کنڈ یکٹر کے برابر اور دوسری کنڈ یکٹر کے پیچھے جس پر ایک جواں سال خوبصورت دبلی پتلی، سوتی ساڑی زیب تن کئے اپنی تمام تر رعناؤں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔اس کی جانب سے مختلف خوشبوؤں کے پھوارے پھوٹ رہے تھے۔اور تمام مسافروں کو مسحور کررہے تھے۔میں اس کے پہلو کی سیٹ پر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود کو قابو میں کیا اور کنڈ یکٹر کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سنیل اس کے پاس والی سیٹ پر......تھوڑی دیر بعد بس آہستہ آہستہ بس اڈہ سے روانہ ہوئی اور مین روڈ پر آکر فراٹے بھرتی ہوئی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔جیسے ہی سنیل نے سگریٹ کے کش لگانے شروع کئے اس لڑکی نے اس کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا سنیل نے اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر مجھ سے اپنی سیٹ بدل لی........اب میں اس کے پہلو کی سیٹ پر تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی جیسے وہ بھی چاہتی تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھوں۔اس کے جسم سے کچے گھڑے کی سی خوشبو آرہی تھی۔اس کے جواں جسم کے لمس نے مجھے مدہوش کردیا تھا۔میں نے اس کے جسم سے اپنے جسم کو اور سٹالیا لیکن وہ بدستور مسکراتی رہی اس کے پاس بیٹھ کر میں عجیب کیفیت سے روبرو تھا......چند منٹوں کے بعد اس نے اپنی سریلی آواز میں کہا کہ اس کی ساڑی کا پلو میرے نیچے ہے میں نے اپنے جسم کو جنبش دی اور اس نے اپنا پلو نکال لیا میں جھینپتے ہوئے اس سے تھوڑا الگ ہوگیا لیکن آغاز گفتگو ہوگیا تھا۔اس نے اپنا نام پوجا سنہا بتایا میں نے بھی اپنا تعارف کرا دیا اس کے ایک سوال کے جواب میں میں نے ایک لمبی تقریر کرڈالی۔

میری بات ختم بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ہم فتح پور پہونچ گئے تھے۔بس سے اترنے سے پہلے میں نے محترمہ کو چائے کے لئے رضامند کرلیا تھا۔ہم دونوں نے چائے اور گرم گرم پکوڑیاں کھائیں بعدہٗ چائے اور پکوڑیاں جیسے ہی میں محترمہ کے لئے لے کر چلا تو سنیل نے کچھ میٹھا بھی لینے کو کہا لیکن میں نے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے بس میں داخل ہوگیا۔محترمہ کی خدمت میں چائے اور پکوڑیاں پیش کردیں۔لیکن اس نے صرف چائے لے لی اور پکوڑیاں لینے سے انکار کردیا ایک دو بار میں نے اسرار بھی کیا کہ یہ گرم گرم مزیدار پکوڑیاں ہیں لیکن اس نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا پھر کیا تھا میں نے پکوڑیوں کا دونہ باہر پھینک دیا۔بس فتح پور سے روانہ ہوچکی تھی۔میں خموشی کی مورت بنا ہوا تھا وہ بار بار میری جانب کنکھیوں سے دیکھتی رہی لیکن میں نے نہ ہی اس کی جانب دیکھا اور نہ ہی خموشی توڑی تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ وہ تلا ہوا نہیں لیتی اگر کچھ میٹھا ہوتا تو وہ ضرور لے لیتی۔ میں نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا ’’نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔دراصل ہم لوگ پکوڑیاں پہلے ہی لے چکے تھے یہ بیکار تھیں اس لئے پھینک دی گئیں۔‘‘ اب میں پہلے کی طرح بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔بڑی شائستگی کے ساتھ بیچ بیچ میں مذاق بھی کرلیا کرتا تھا وہ حسبِ معمول مسکرا دیا کرتی۔ایسا محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اجنبی تھے۔وہ کھل کر مجھ سے ایک بے تکلف دوست کی طرح بات کررہی تھی۔وہ بلا کی ذہین، سیاسی سماجی

معلومات میں مکمل مہارت رکھتی تھی اس سے بات کرنے میں خوب مزہ آرہا تھا۔ اکثر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے ٹکرا جاتا اور وہ اپنا ہاتھ میری جانگھ پر رکھ لیا کرتی اور دوسرے لمحہ شرماتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجھے متوجہ کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لیا کرتی اور کم حق ہو ایسا ہی میں اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ اس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو اور لمس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے ہزاروں تیر میرے سینے میں پیوست کر دئے تھے۔ اور جب وہ کھلکھلا کر ہنستی تو فضاؤں میں ست رنگی ساز بجنے لگتے...... میں کچھ زیادہ ہی بے تکلفی سے کام لے رہا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بتدریج بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس کے پاس بیٹھنے کے لئے کسی قسم کی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ لاپرواہی و بے اعتنائی کے ساتھ میں اس سے چپکا بیٹھا تھا۔ اس کے بالوں سے عجب طرح کی خوشبو میرے ذہن کو معطر کر رہی تھی۔ اس کی ریشمی زلفیں میری کلائی پر منڈلا رہی تھیں۔ میں دنیا و مافیا سے بے نیاز اپنی ایک الگ دنیا میں سیر کر رہا تھا اس کی تمام تر رعنائیاں میرے لئے کسی تحفے سے کم نہیں تھیں۔ اس نے معلوم کیا کہ ہم الہ آباد کیوں جا رہے ہیں میں نے اپنا ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے رکھتے ہوئے بڑے غرور و لاپرواہی سے کہا کہ ہم دونوں لاگریجویٹ ہیں اور اتر پردیش بار کاؤنسل الہ آباد سے اپنا رجسٹریشن لینے جا رہے ہیں۔ جو پانچ ماہ سے التوا میں ہے۔ یہ کہتے ہوئے اپنے سر کو اس کے بہت قریب لے گیا اس سے آنے والی خوشبوؤں سے محظوظ ہونے لگا اور آنکھیں موند کر مستقبل کی سیر کرنے لگا۔ جہاں میں اور پوجا کے سوا کوئی نہیں میں اس کے گداز جسم کو اپنی باہوں میں لے کر بے تحاشہ پیار کرنے میں محو تھا اسی کے معترض نہ ہونے کی وجہ سے میری ہمتوں میں اضافہ ہوا اور میں ہواؤں کے دوش پر تھا۔ ''میں آپ کی اس سلسلہ میں مدد کر سکتی ہوں'' پوجا کی آواز نے میرا سکوت توڑا اور میں نے خیالوں کی دنیا سے واپس آ کر معلوم کیا کہ آپ ہماری کیا مدد کر سکتی ہیں۔ میرا ہاتھ بدستور اس کے کاندھے کے پیچھے اس کے کھلے بالوں پر تھا اور جسم اس کے جسم سے بالکل سٹا ہوا۔ ''دراصل میرے ڈیڈی الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں اور میں کانپور میں سول جج......'' جیسے یہ آواز میری سماعت سے گذری میرا دماغ سن ہو گیا جیسے ۴۴۰ واٹ کا کرنٹ میرے پورے جسم میں سرایت کر گیا اور مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا حیرت وتعجب سے میں اسے دیکھنے لگا۔ اس نے پھر دہرایا کہ وہ کانپور میں سول جج ہے وہ اپنے ڈیڈی سے کہہ کر آج ہی ہمیں بار کونسل کا رجسٹریشن دلا دیں گی۔ میں نے نہایت ادب وشائستگی سے کہا کہ نہیں کوئی بات نہیں ہم خود ہی حاصل کر لیں گے۔ پھر خموشی نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ بس میں کچھ لوگ ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے تو کچھ سو رہے تھے اور کچھ اخبار بینی میں مصروف تھے۔ بس فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا تھا اور خموشی کی مورت بنا بیٹھا خود کو مجرم قرار دیتے ہوئے احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ میں ایک دم الرٹ ہو گیا تھا اور اپنی گفتگو کا محاصرہ کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرنے لگا...... یقیناً ایسی گفتگو کسی سول جج کے شایان شان ہرگز نہیں تھی اور وہ بھی چیف جسٹس کی بیٹی۔؟ جس کی تعظیم ہم پر لازم ہی نہیں بلکہ فرض بنتی ہے۔ جو ہر لحاظ سے قابلِ احترام ہیں۔

میں شرمسار ہو کر اپنے جسم کو سمیٹے بیٹھا تھا اپنی ٹائی درست کی، کوٹ کے بٹن لگائے اور بے حد محتاط ہو گیا دس منٹ بعد اس نے اپنے جسم کو گھما کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا کہ کیا بات ہے آپ خموش کیوں ہو گئے...... آپ فکر مند نہ ہوں آج آپ کو آپ دونوں کا سرٹفکٹ مل جائے گا۔ میں نے پھر بڑے ادب کے ساتھ آہستہ سے کہا کہ نہیں نہیں...... آپ کیوں تکلیف کریں گی'' اور پھر خموشی نے اپنے پیر پسار لئے۔ میں ندامت سے مزید شرمسار ہو رہا تھا کہ اچانک اس نے میری کلائی پکڑ لی اور کچھ تلخی سے کہا کہ ''کیا بات ...... خموشی کی مورت کیوں بنے بیٹھے ہو...... یار تم مجھے کالج لائف میں پہونچا کر تنہا کیسے چھوڑ سکتے ہو۔ تقریباً دس برس کے بعد میں نے وہ لطف اٹھایا ہے جو صرف کالج لائف میں ہی مل سکتا تھا۔ بے تکلفی بے اعتنائی اور کسی حد تک بے ادبی...... اور کچھ کہنے کچھ سننے کی مکمل آزادی...... جہاں لڑکی اور لڑکے میں کوئی امتیاز نہیں......''

لیکن میں احساس کمتری کے احساس میں غوطہ زن تھا۔ اس کے منصب کے رعب سے میری زبان جیسے سل گئی ہو۔ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ لمحہ بھر میں حالات بدل گئے تھے۔ اب میں ایک جواں سال الہڑ خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ نہیں بلکہ ایک سول جج کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اس نے میری زبان کھلوانے کی کئی کوششیں کیں لیکن کامیاب نہ ہو

سکی میں تو گونگا بہرہ ہو گیا تھا۔ اور ہاں ہوں کے علاوہ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہا تھا...... وہ میری اس تبدیلی سے بے حد حیران اور قدرے پریشان تھی کہ ایسا باتونی لڑکا خموشی کی مورت بنا کیونکر بیٹھا ہے۔ ایسا اس نے کیا کہہ دیا جسے سن کر وہ اتنا محتاط ہو گیا کہ اس نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر مجھ سے الگ تھلگ کر لیا۔

''اب آپ دونوں ہمارے بنگلے پر چلیں گے۔ جہاں میں آپ کو اپنے ڈیڈی سے ملواؤں گی اور پھر پورے شہر کی سیر کراؤں گی۔ اس بیچ آپ کے سرٹفکٹ بھی تیار ہو جائیں گے۔'' میں نے مسکینوں والی شکل بنا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ الہ آباد شہر کے حصار میں اس نے کنڈیکٹر سے بس رکوانے کو کہا ہم دونوں بس سے اتر کر اس کے پیچھے ہو لئے چند قدموں کے بعد ہی ایک بنگلے میں داخل ہو کر ہمیں مہمان خانے میں پہونچا دیا اور تحکمانہ انداز میں ہم سے جلد فریش ہو کر آنے کو کہا اور تاکید کی کہ ہمیں ۱۰ بجے تک ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لئے پہونچ جانا ہے۔ جہاں ہمارا تعارف وہ اپنے ڈیڈی سے کرائے گی اور سرٹیفکٹ کے لئے بھی کہے گی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بڑی نرمی سے کہا کہ ''پلیز وقت پر پہونچ جانا۔''

ہم دس بجے سے پہلے ہی ڈائننگ ٹیبل پر پہونچ گئے تھے جہاں وہ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ جینز ٹاپ زیب تن کئے ایک الہڑ کالج گرل کی طرح نہا نے دھوئے صاف ستھرے بالوں میں سے ابھی پانی کی بوندیں شرارت کرنے پر تلی تھیں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی...... جسٹس سنہا جیسے ہی تشریف لائے ہم دونوں تعظیماً کھڑے ہو گئے پوجا نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہم اس کے دوست ہیں اور اتر پردیش بار کاؤنسل سے سرٹفکٹ لینے آئے ہیں جو گذشتہ پانچ ماہ سے التوا میں ہے۔ جسٹس سنہا نے اپنے پیش کار کو ضروری ہدایات دیں بعدہٗ ہائی کورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم شانتی نکیتن کے برلا پلاٹینم کے اندھیرے ہال میں دن میں تارے گن رہے تھے۔ ایک جانب سنیل اور دوسری جانب پوجا بیٹھی تھی۔ گھنگھور اندھیرا تھا وہ میری کلائی کو بڑی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا تھا۔ اینکر مصنوعی آسمان پر تاروں کی بازگشت پر لیکچر دے رہا تھا غالباً پوجا نہ تو کسی لکچر میں دلچسپی رکھتی تھی اور نہ ہی وہ میری طرح دن میں تارے گن رہی تھی۔ بلکہ وہ میرے جسم میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہی تھی اس نے اب اپنا ایک ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا تھا ۔سردی کے موسم میں مجھے پسینے چھوٹ رہے تھے میں نے اپنے ہاتھ کو اس سے چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی لیکن ناکام رہا شاید اوپر والے کو ہی مجھ پر رحم آ گیا کہ ''شو'' اختتام پذیر ہوا اور ہال روشنیوں سے نہا گیا۔

ہم نے ہلکا پھلکا کچھ کھایا پیا اور آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگے اس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا اور وہ ایک فلاسفر کی طرح زندگی کا فلسفہ بیان کر رہی تھی کہ ''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو بے حد پسند آ جاتا ہے۔ اور وہ اس کی روح میں سما جاتا ہے اس کے علاوہ چاروں سمت اس کو کچھ نظر ہی نہیں آتا اور وہ اسی کو اپنی دنیا تصور کرنے لگتا ہے......'' اس نے کچھ رک کر کہا...... ''اگر ایسا کبھی یا کہیں ہو تو ہمیں چاہئے کہ ایسے لمحات کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور ایک دوسرے کے لئے معاون ثابت ہوں...... پتہ نہیں یہ لمحات یہ پل پھر کبھی ان کی زندگی میں آئیں یا نہ آئیں یا پھر ان کو کوئی پسند آئے یا نہ آئے......؟ وہ خموش ہو گئی تھی اور غالباً مایوس بھی میں نے اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا جس کی وجہ سے اس کے شہابی چہرے پر مایوسی کی لکیریں اُبھر آئی تھیں لیکن اسی لمحے میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے'' اس کے چہرے پر حیرت انگیز مسکراہٹ تھی چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا مایوسی کی لکیریں یکسر غائب ہو گئی تھیں اور اس کے چہرے پر اس قدر نور آ گیا تھا جیسے آسمان سے اتری پری ہو۔ جسے میں دیکھتا ہی رہ گیا شاید پہلی بار ہم دونوں نے اک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کو بغور دیکھا تھا اور وہ شرما کر اپنی نظریں جھکاتے ہوئے مجھ سے سٹ کر یوں گویا ہوئی...... آپ مل گئے...... کہ جہاں مل گیا۔

◆◆◆

غزل

ڈاکٹر شفیق اعظمی
پٹھان ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ
موبائل نمبر 9450191840

ستم شعار رہا ہے جو آسماں کی طرح
کبھی ملا ہی نہیں ہم سے مہرباں کی طرح

اگر تھیں میرے عزائم سے آندھیاں عاجز
تو میرے سر پہ بھی سورج تھا سائباں کی طرح

وہ دے گیا مجھے ترک تعلقات کی دھوپ
میں جس کے واسطے اب تک تھا سائباں کی طرح

ہیں آج ذروں کی مانند، گرد کی صورت
مگر ہمیں تو یہاں کل تھے آسماں کی طرح

نہیں ہیں تیغ و تبر، پھر بھی ایسے ہیں الفاظ
زباں سے نکلیں گے چبھ جائیں گے سناں کی طرح

شفیق جائیں بھی تو جائیں ہم کہاں آخر
زمیں بھی ہوگئی دشمن جب آسماں کی طرح

•••

غزل

سلیم انصاری
ایچ آئی جی۔۳ آنند نگر ادھارتل،
جبل پور (ایم۔پی)

انار کو رگِ لہو میں غزال ہم نے کیا
جنوں سے دشت کا رشتہ بحال ہم نے کیا

بکھر کے رہ گئے اپنے وجود میں لیکن
کبھی دراز نہ دستِ سوال ہم نے کیا

لٹائے اشک کے گوہر کھلائے درد کے پھول
زمینِ شعر تجھے مالا مال ہم نے کیا

اسی زمین نے کیا آخرش قبول ہمیں
تمام عمر جسے پائمال ہم نے کیا

سلیم پہلے اسے سارے اختیار دیے
پھر اس کے بعد کوئی عرضِ حال ہم نے کیا

•••

ڈاکٹر بشریٰ بانو
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو مہیلا مہاودیالیہ، امین آباد، لکھنؤ

'چریویتی چریویتی' سے ماخوذ اقتباس

"اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک کی مراٹھی زبان میں تحریر خودنوشت سوانح عمری 'چریویتی چریویتی' کا اردو ترجمہ "چلتے رہو چلتے رہو" کے نام سے شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر عباس رضا نیر نے خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ رفاقت کا دریا، اردو میں ہندکیوں اور ہاتھ سے لکھی آئین کی کاپی، عنوان کے تحت مضمون اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔" ایڈیٹر

رفاقت کا دریا

یہ کہنا بالکل بھی غلط نہ ہوگا کہ 'مہاودیالیہ ستسنگ' اچھے ساتھ کا دریا ہی تھا۔ میں گاؤں کے اسکول کا سب سے ہونہار طالب علم تھا۔ لیکن بی۔ایم۔ سی۔ کالج میں میری قابلیت کا غبارہ ہوا ہوگیا۔ کالج میں ایک سے بڑھ کر ایک قابل بچے تھے۔ لیکن آج کے جیسی تناؤ بھری، عجیب صورت حال تب نہیں تھی۔ خوش خط والے ایک لڑکے کی نوٹ بک میرے لیے ایک کتاب سے بھی زیادہ مفید تھی۔ اس دوست کا نام تھا ڈاکٹر سی۔جی۔ ویدیہ جن کے نوٹس کی وجہ سے میرے جیسے کئی لوگ ڈگری پانے میں کامیاب رہے۔

جس بی۔ایم۔سی۔ کالج میں ہم طالب علم تھے۔ اسی کالج میں ہمارا یہ دوست طویل عرصہ تک پرنسپل رہا۔ ماڈرن کالج کے پرنسپل ایم۔ بی۔ لمیئے بارامتی کے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بودھا، گوکھلے مہاودیالیہ کے پرنسپل ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ گوساری، پونے یونیورسٹی کے منیجمنٹ شعبہ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر گوپال بیٹھے، پونے کے اکاؤنٹنسی کی، گنگلے کلاسیز، کے دادا گنگلے جیسی تعلیمی دنیا کی نامور ہستیاں میری ہم جماعت تھیں۔ کالج کی ودیاپار سنگھٹن کے انتخاب میں شہر کے باہر ہوتے ہوئے بھی میں منتخب ہوکر آیا یہ صرف ان دوستوں کے سبب ہوا اور تو اور اس کے لیے لی گئی تصاویر کے لیے میں نے جو کوٹ پہنا تھا وہ بھی میرے ایک دوست کا ہی تھا ایسے تھے میرے دوست۔

ان سبھی میں نظریاتی ہم آہنگی ہوئی تو راجہ بھاؤ چتلے سے۔ آج پونے کی شان کہلانے والے مٹھائی کاروبار کی دنیا کے مشہور ہوگئے۔ بندھو مٹھائی والے کو بنانے میں اہم کردار نبھانے والے راجہ بھاؤ کا یقین تھا کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ محنت اور لگن کے سبب ہی ہماری دوستی گہری ہوئی۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں پونے سے بھی کئی کوس دور بھلوڑی سے آنے والا معیاری دودھ صارفین تک پہنچانا ہے تو صبح سویرے نکلنا پڑتا تھا۔ دودھ کا زیادہ وقت تک محفوظ رکھنا اس زمانے میں ممکن نہیں تھا پھر راجہ بھاؤ خود سائیکل سے گھر گھر جاکر دودھ بانٹتے تھے۔ میں بھی اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ مالی حالات کچھ حد تک بہتر بنانے کے لیے صبح اٹھ کر اخبار بیچتا تھا۔ اس سائیکل کے سفر کے دوران ہماری قربتیں بڑھتی گئیں

وقت کے ساتھ ہمارے شہر بدلے۔ میں ممبئی میں، توجہ بھاؤ پونے میں وہ ایسا زمانہ تھا جس میں آج کے جیسے ہر لمحے کی خبر دینے والا سوشل میڈیا کا تصور ہی نہیں تھا اور فون پر بات کرنا خاصہ مہنگا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود آج کی زبان میں کہیں تو ہم دونوں ہی اپنے اپنے کیریئر بنانے میں منہمک تھے۔ پھر بھی اگر کسی کام سے پونے جانا ہوا تو 'راجہ بھاؤ دکان میں ہیں کیا؟' یہ معلوم کرنے کا موقع میں کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ راجہ بھاؤ کے متعدد ایم۔ پی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ اور وزراء سے اچھے تعلقات تھے وہ سماجی امور کے لیے مجھ سے پورے حق سے کام کروالیتے تھے۔ انسانوں کو پہچاننے اور ان سے تعلقات رکھنے میں راجہ بھاؤ کو مہارت حاصل تھی۔ ۱۹۹۴ میں جب مجھے کینسر ہوا تو وہ اس کی اطلاع پاتے ہی مجھ سے ملنے ممبئی آئے۔ ایم۔ پی۔ ہونے کے سبب میرا علاج سرکاری اخراجات پر ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس سے وابستہ نظر نہ آنے والے اخراجات بھی ہوتے ہوں گے۔ جس کی میرے دوست کو فکر ہوئی۔ چنانچہ میری صحت کا حال معلوم کرکے نکلتے وقت "بہت کام

پڑے ہیں، جلدی ٹھیک ہو جاؤ اور کوئی ضرورت ہوتا بتلانا'' ایسا کہتے ہوئے مجھے زبردستی ایک ڈمانڈ ڈرافٹ پکڑا دیا۔ بیماری کے خوف سے میرے آنسو نہیں نکلے تھے لیکن دوست کے اس مخلصانہ جذباتی رویے کے سبب میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میرے اس دوست کے اقتصادی معاملات میں شفافیت دیکھنے لائق تھی۔ اتنا بڑا بیوپاری ہوتے ہوئے بھی لین دین کا حساب صاف و شفاف رکھنے کی وجہ سے نقد رقم نہ دیتے ہوئے انہوں نے ڈیمانڈ ڈرافٹ دیا۔ انکم ٹیکس افسران کے ذریعہ مجھے معلوم تھا کہ چتلے برادران انکم ٹیکس کی ایک ایک پائی سرکار کو ادا کرتے ہیں۔ ڈرافٹ کے طور پر اپنے شفاف حساب کتاب کی گویا اس کے رسید دی تھی۔ پونے کے چتلے برادران کسی کو مفت کچھ دے دیں گے۔ اس کا کسی کو یقین نہیں تھا لیکن جب تک راجہ بھاؤ تھے میں دہلی میں رہوں یا ممبئی وہ خود پتہ لگا کر دیوالی میں میرے لیے ''شری کھنڈ'' کا ڈبہ بھیجتے تھے۔ یہ شریں حقیقت آج بھی بہتوں کو چونکا دیتی ہے۔

راجہ بھاؤ نیک دل والوں کی میری کہکشاں کے ایک ستارے تھے۔ راجہ بھاؤ چتلے جو سماجی کام لے کر میرے پاس آتے تھے۔ ان میں مٹھائی والوں کے کام ہونا فطری تھا۔ لیکن اسی راجہ بھاؤ نے مہاراشٹر میں پہلا لڑکیوں کا انجینئرنگ کالج کھلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ایک بار ہوا یہ کہ مہارشی کروے کے ہنگڑے استری سنستھان' کے انجینئرنگ کالج برائے خواتین کی فائل دہلی میں اٹکی ہوئی تھی۔ مہاراشٹر میں تعلیم نسواں بیواؤں کی شادی کرانے اور دیگر سماجی و اصلاحی کاموں کے لیے مہارشی کروے مشہور تھے۔ راجہ بھاؤ نے مجھے اس مسئلے پر دھیان دینے کے لیے کہا۔ اس وقت کے سکریٹری وزارت برائے انسانی وسائل و بہبود کو نہ تو مہارشی کروے کے بارے میں اور نہ تو ان کے ہنگڑے سنستھا کے بارے میں کچھ بھی پتہ تھا۔ اس شرمناک سچائی سے ہم سب کو غصہ آ گیا۔ وزیر سے مل کر میں نے حالات کے بارے میں بتایا۔ وہ کام ہو گیا اور کالج کھل گیا۔ کچھ عرصے بعد چتلے بھائیوں نے اس کالج کے لیے ہاسٹل بنوایا۔ اس کے افتتاح کے لیے مجھے بلانا راجہ بھاؤ نہیں بھولے۔

ان رفیقوں نے میرے اندر سماجی سروکار کی مشعل ہمیشہ جلائے رکھی۔ سماج کا قرض چکانے کے ساتھ ساتھ میں اس کوشش میں رہتا ہوں کہ میں ان اپنوں کا احسان بھی چکا سکوں۔

اردو میں ہند کیوں

دوستو کی نظر میں میں سرگرائے رکھنے والا بے لوث انسان تھا۔ پارلیمنٹ کے سیشن کے دنوں میں دہلی رہنا پڑتا تھا۔ سیشن کا کام ختم ہونے کے بعد مجھے لگتا جیسے بہت خالی وقت بچ جاتا ہے۔ میں الگ الگ موضوعات کی زیادہ جانکاری پانے میں وہ وقت بسر کرنے لگا اسی کی بہ نسبت بہت سے الگ الگ موضوعات میں الجھتا گیا۔ میں قانون میں گریجویٹ ہوں۔ لہٰذا آئین بھی پڑھا تھا اس لیے جب پارلیمنٹ ممبر نے اردو میں حلف لیتے وقت 'ہند' لفظ کہا تو مجھے تعجب ہوا تھا۔ آئین میں ہمارے ملک کا نام بھارت یا انڈیا ہے۔ مجھے لگا بیشک ہند لفظ کا جذباتی مول ہے لیکن حلف لیتے وقت اس کا استعمال صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ میں نے وہ مدعا اٹھایا۔ اس کے بعد سے اردو میں حلف لیتے وقت بھارت یا انڈیا لفظ کہا جانے لگا۔

ہاتھ سے لکھا آئین کی کاپی

میری کوششوں کی وجہ سے آئین کی ہندی کاپی اب مہیا ہو رہی ہے۔ یہ قصہ دلچسپ ہے۔ پارلیمنٹ کے کتب خانہ کے بھارتی آئین کی اصل انگریزی کاپی نے میرا ذہن متوجہ کیا میں نے اس کی ہندی کاپی کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو پتا چلا کہ مہیا نہیں ہے لیکن دلچسپ معلومات ضرور فراہم ہوئیں۔ بتایا گیا کہ ۱۹۵۶ء میں تیار شدہ اصل ہندی ورژن مہاراشٹر کے شری وسنت ویدیہ نے لکھا ہے۔ ان کی دستی تحریر کاری کے لیے جرمنی سے سنہرے صفحہ اور چین کی مشہور کمپنی سے سیاہی منگوائی گئی تھی۔

واٹ اسکین قسم کی لکڑی سے بنے قلم سے دستی تحریر تیار کرنے میں ویدیہ کو ایک سال لگا۔ ہندی ورژن شری رام، شری کرشن، گوتم بدھ، جھانسی کی رانی وغیرہ کی تہذیبی اور تاریخی شخصیات کے خاکے ہیں۔ میری مانگ پر یہ خاکے عام نمائش کے لیے پارلیمنٹ نہ صرف رکھے گئے ہیں بلکہ اس کی ہندی کاپی بھی فروخت کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

•••

تبصرہ

نام کتاب	:تنقیدی دریچے (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
مصنف	:محمد وصی اللہ حسینی
ضخامت	:216 صفحات
قیمت	:133 روپے
سن اشاعت	:2017

ملنے کا پتا: 53/4، شتر خانہ، اُدے گنج، لکھنؤ 226001

تبصرہ نگار	:ابراہیم افسر

زیر تبصرہ کتاب ''تنقیدی دریچے'' لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے جواں سال صحافی اور ادیب محمد وصی اللہ حسینی کی پہلی ادبی کاوش ہے جو منصۂ شہود پر آئی۔ محمد وصی اللہ حسینی نے اس کتاب میں اُن مضامین کو شامل کیا ہے جو انھوں نے روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ، میں صحافتی خدمات انجام دیتے وقت تحریر کیے تھے۔ موصوف کے یہ مضامین ملک کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں صفحۂ قرطاس کی زینت بن چکے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین ریڈیو پر بھی نشر ہو چکے ہیں اور بعض کو ملک کی مختلف یونی ورسٹیز میں منعقدہ اُردو سمیناروں میں سامعین کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ موصوف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صحافت اور ادب دونوں کا توازن اپنے مضامین میں بنائے رکھا ہے۔ ان کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کیجیے اس میں تحقیقی اور تنقیدی معلومات کا بیش بہا خزانہ قاری کے سامنے وا ہو جائے گا۔ مطالعۂ مضامین کے وقت قاری ادب اور صحافت کے دبیز فرق کو خود بہ خود محسوس کر لے گا۔ محمد وصی اللہ حسینی نے اپنا پہلا مضمون ''علامہ سید سلیمان ندوی کے شعری کمالات'' محض 16-15 سال کی عمر میں تحریر کیا تھا۔ وصی اللہ حسینی نے اپنی کتاب میں لکھنؤ کے ادبی اڈّوں کا ذکر پورے طمطراق اور طمانیت کے ساتھ کیا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کی وفات کے بعد جب رسالہ آج کل نئی دہلی میں باقاعدہ ایک سیریز ''ادبی اڈے'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی تو اس میں وصی اللہ حسینی نے بھی لکھنؤ کے ادبی اڈوں کے بارے میں مزید معلومات اپنے مضامین میں فراہم کیں۔ موصوف نے اپنی کتاب میں کل 22 مضامین کو شامل کیا ہے۔ گیارہ مضامین شاعری پر (علامہ سلیمان ندوی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ولی انصاری، خمار بارہ بنکوی، والی آسی، ڈاکٹر اختر بستوی، شاطر حکیمی، ملک زادہ منظور احمد اور جنیوا رائے)، دو لکھنؤ کے مشہور ادبی اڈوں پر (دانش محل اور ملک زادہ منظور احمد کے ادبی اڈے)، ایک نسائی ادب کی خدمات پر، ایک صنعت منقوطہ پر، چار مضامین جنگ آزادی اور ادبی شخصیات کے حوالے سے (قاضی عدیل عباسی، جعفر علی نقوی، علی برادران اور جنگِ آزادی میں بستی کے مسلمانوں کا حصہ)، ایک مضمون وضاحت حسین رضوی کی ناولٹ نگاری پر، ایک مضمون وحید الدین سلیم کی ادبی خدمات کے حوالے سے اور ایک مضمون ملک زادہ منظور احمد کی تنقید نگاری پر ہے۔

محمد وصی اللہ حسینی نے اپنے مضامین میں اپنے ادبی ذوق کو بالیدہ رکھتے ہوئے تحقیقی انداز کو پیشِ نظر رکھا۔ اپنے مضمون ''وحید الدین سلیم کی علمی و ادبی خدمات'' میں موصوف نے ان کی مشہور زمانہ کتاب ''وضع اصطلاحات'' پر تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔ اس مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سلیم پانی پتی نے اپنے ادبی بزرگوں کی تقلید کے بجائے نئے نظریے سے ادب کی خدمت کی۔ انھوں نے اپنی لسانی ذوق غائر مطالعہ کی بنا پر کئی ایسی اصطلاحات وضع کیں جن کا بدل موجودہ دور میں بھی کوئی پیش نہیں کر سکا ہے۔ اخباری reporter کے لیے ''نمایندہ'' اور volunteer کے لیے ''رضا کار'' کی اصطلاح انھیں کی بنائی ہوئی ہے۔ اسی طرح کی نہ جانے کتنی اصطلاحیں اُردو زبان و ادب میں مولانا سلیم پانی پتی کی وضع کردہ ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی شاعری کے حوالے سے محمد وصی اللہ حسینی نے لکھا ہے کہ سید سلیمان ندوی امیر مینائی سے بہت متاثر تھے اور ان کا دیوان 'مرأۃ الغیب' کا وہ اکثر و بیشتر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندوی کو امیر مینائی کے بہت سے اشعار ازبر تھے۔ جنگِ آزادی کے جاں باز سپاہی: قاضی عدیل عباسی کے تحت موصوف نے قاضی عدیل عباسی کی ہمہ جہت شخصیت کے علاوہ ان کی سیاسی، صحافتی اور ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ محمد وصی اللہ حسینی نے اپنے ایک اور تاریخی مضمون میں ضلع بستی سے تعلق رکھنے والے مجاہدِ آزادی مولوی جعفر علی نقوی کی 1857 کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ 'علی برادران کی شخصیت سازی میں بی اماں کے کردار' کے حوالے سے موصوف نے تحریر کیا کہ مولانا شوکت علی جوہر اور مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کو تراشنے اور نکھارنے اور ہندوستان کے ان جیالے سپوتوں کے کردار سازی میں ان کی والدہ بانو

بیگم عرف بی اماں کی تعلیم وتربیت نمایاں رہی ہے۔ہوم رول مومینٹ کی روحِ رواں مسز اینی بسینٹ نے بی اماں کو 'شیر دل' (Lion Hearted) کا خطاب عطا کرنے کے ساتھ She quailed before no danger کے تاریخی کلمات بھی کہے۔محمد وصی اللہ حسینی نے کیفی اعظمی کی شاعری اور انسانیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بڑھ کر اچھے انسان تھے۔کیفی اعظمی نہ صرف ترقی پسند شاعر تھے بل کہ ترقی پسند ذہنیت کے مالک اور دل دادہ بھی تھے۔

محمد وصی اللہ حسینی نے شکیل بدایونی کی رومانوی شاعری پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔شکیل بدایونی کی فلمی اور ادبی شاعری پر اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے لکھا کہ انھیں فلم انڈسٹری میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ادبی حلقوں میں نمایاں شناخت قائم کی۔دراصل شکیل بدایونی نے ادبی کلاسیکل انداز کے ساتھ فلموں میں بھی کلاسیکل رومانیت کی نمایندگی کی۔رومانی گیت اور شاعری ان کی کامیابی کا راز تھا۔مشترکہ تہذیب اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کے دل دادہ کنور مہنید رسنگھ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے محمد وصی اللہ حسینی رقم طراز ہیں کہ اُردو مشاعروں خاص طور پر ہند و پاک میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ان کی شرکت لازم وملزوم تھی۔موصوف نے والی آسی کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ ان کے شعری مجموعوں 'شہد اور 'موم' کے تناظر میں کیا۔شاطر حکیمی کی نعتیہ شاعری کا جائزہ ان کے وسیع مطالعے کا غماز ہے۔موصوف نے اس مضمون میں اُردو ادب میں نعت گوئی کی روایت پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ملک زادہ منظور احمد کا جہانِ تنقید پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا کہ ملک زادہ منظور احمد کی ذات کو صرف 'ناظم مشاعرہ' تک محدود کر دینا ان کی ذات اور ادبی کارناموں پر پردہ پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ جب تک قاری ان کی تحریر کردہ کتابوں 'اُردو کا مسئلہ'، 'مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن'، 'غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ'، 'مولانا آزاد: الہلال کے آئینے میں' اور 'شہر سخن' کا مطالعہ نہیں کرے گا تب تک ان کی تنقیدی بصیرت سے آگہی نامکمل ہے۔

اُردو ناولٹ نگاری کے حوالے سے محمد وصی اللہ حسینی نے بتایا کہ وضاحت حسین رضوی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ''اُردو ناولٹ کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ'' جیسے مشکل ترین موضوع کا انتخاب کیا۔جب کہ طلبا اپنے لیے آسان موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔اُردو ناولٹ کی تنقید اور تاریخ پر جب بھی قلم اٹھایا جائے گا تو میرا ماننا ہے کہ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے تحقیقی حوالوں کے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔دانش محل: کتابوں کا تاج محل' میں لکھنؤ کے اس ادبی مرکز پر خونِ جگر صرف کیا ہے۔ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دانش محل کا قیام 1942 میں عمل میں آیا۔دراصل، مولوی عبدالحق، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیات کی دیرینہ خواہش تھی کہ لکھنؤ میں ایک ایسا ادبی مرکز قائم کیا جائے جہاں پر ادبی کتابیں بھی دستیاب ہو جائیں۔دور دراز سے آنے والے علما، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں کے بیٹھنے کے لیے مستقل طور پر ایک ادبی ٹھکانا بھی ہو۔دانش محل کو قائم کرنے کا قرعہ فال محمد نسیم کے نام نکلا۔آج دانش محل صرف کتابوں کی دستیابی کا مرکز ہی نہیں ہے بل کہ یہ اُردو ادب اور لکھنوی تہذیب کا مرکز ومحور بھی بنا ہوا ہے۔مذکورہ خوبیوں کے سبب پروفیسر احتشام حسین دانش محل کو 'دارالقرار' اور 'دارالامان' کہتے تھے۔کتاب کا آخری مضمون 'صنعتِ غیر منقوطہ' پر مبنی ہے۔اس مضمون میں محمد وصی اللہ حسینی نے اس صنعتِ غیر منقوطہ کی اہمیت وافادیت کے ساتھ اس کی ابتدا پر تحقیقی شواہد کے ساتھ گفتگو کی ہے۔موصوف نے اس مشکل ترین صنف میں مولانا ولی رازی اور مولانا صادق بستوی کے علمی کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔اُردو ادب میں غیر منقوطہ صنف کے موجد کے طور پر انشاء اللہ خاں انشا کا نام سرفہرست ہے۔اس مشکل صنف کی جانب اُردو میں کم ہی توجہ دی گئی ہے۔

بہر کیف! محمد وصی اللہ حسینی کی یہ کتاب اپنے اندر مختلف عناوین کے ساتھ معلومات کا بیش بہا خزانہ لیے ہوئے ہے۔کتاب کے فلیف پر پروفیسر شارب ردولوی نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقم کیا کہ 'تنقیدی دریچے، محمد وصی اللہ حسینی کے ادبی تاریخی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں ادب، لسانیات، شاعری، تہذیب وتمدن ہر موضوع پر مضامین شامل ہیں۔' حقانی القاسمی نے بھی اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ 'وصی اللہ حسینی کے تنقیدی مضامین میں جو گہرائی، سنجیدگی اور متانت ہے وہ ان کے تابندہ ادبی مستقبل کی شہادت ہے۔مشہور صحافی، کالم نگار اور ادیب سہیل انجم نے محمد وصی اللہ حسینی کی ادبی کارکردگی پر ناقدانہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ 'اگر آپ اس کتاب 'تنقیدی دریچے' کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ محمد وصی اللہ حسینی کا دائرۂ مطالعہ کتنا وسیع ہے اور ان کے قلم میں کتنی وسعت اور رنگا رنگی اور کشادگی ہے۔'

•••

تبصرہ

نام کتاب :علامہ ڈراما

مصنفہ :صالحہ صدیقی

صفحات :ضخامت 111

قیمت 150 روپئے ،

ناشر :صالحہ صدیقی

کتاب ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر :مہر فاطمہ

زیرِ تبصرہ کتاب ''ڈرامہ علامہ'' جیسا کہ نام سے ہی عیاں ہے علامہ اقبال کی زندگی کے ارد گرد بنا صالحہ صدیقی کا لکھا ہوا بے حد خوبصورت ڈرامہ ہے، یہ ڈراما سات مناظر پر مشتمل ہیں۔اس ڈرامے کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال کے مختصر وقفے کے بعد ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی گئی جس کا ذکر مصنفہ نے اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔پیش نظر ڈرامے کا دیباچہ عالمی شہرت یافتہ معروف افسانہ نگار مرزا حامد بیگ (لاہور ، پاکستان) نے لکھا ہے، تو اس ڈرامے میں تقریظ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی (لاہور، پاکستان) نے۔اس کتاب میں علامہ اقبال کی سوانح عمری بھی شامل ہے جس سے نئے پڑھنے والوں کو علامہ اقبال کو سمجھنے، جاننے اور ان کی شاعری سے واقفیت کا بھی موقع فراہم ہوتا ہے۔اس ڈرامے کی ابتدا علامہ اقبال کی پہلی شادی کی کشمکش وتصادم سے ہوتی ہے۔پھر ان کی دوسری اور تیسری شادی کی کشمکش کو بھی اس ڈرامے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہیں۔اس ڈرامے میں علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے اس ڈرامے کی خاص بات مجھے جو اس ڈرامے سے جوڑے رکھی وہ یہ کہ اس میں پیش کردہ مناظر، زبان ، عہد وماحول، رہن سہن، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، تہذیب وثقافت، سب کچھ اسی زمانے کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔جس سے ہمیں اس عہد کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں ڈرامے کے مطالعے کے وقت پیش کردہ واقعات بھی ایسے ہیں کہ ہم خود کو بھی اسی زمانے میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس ڈرامے میں مشاہر نقد وادب کے نظریات بھی شامل ہیں ۔اس ڈرامے کے سلسلے میں ڈاکٹر رضا حیدر، ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی لکھتے ہیں کہ:

''صالحہ صدیقی نے علامہ اقبال کی کشمکش وتصادم سے نبرد آزما خانگی زندگی پر مبنی ڈرامہ ''علامہ'' لکھا ہے۔حالانکہ اس موضوع کو بہت کم ہی لوگوں نے اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے، ان کی زندگی کے اس پہلو کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنا واقعی قابل تعریف ہے۔یوں تو اردو شاعروں کی زندگی پر ڈراما پہلے بھی لکھا اور اسٹیج بھی کیا جاتا رہا ہے جن میں اہم نام مرزا غالب کا ہے، جن پر ہر سال غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروڈکشن کے زیر اہتمام ڈراما ''غالب کی واپسی'' اور دیگر ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں۔لیکن علامہ اقبال کی زندگی پر مبنی میری نظر میں یہ پہلا ڈراما ہے جسے صالحہ صدیقی نے تحریر کیا ہے جس کے لیے یقیناً وہ مبارکباد کی مستحق ہے، امید ہے ادبی حلقوں میں بھی ان کی اس کوشش کو سراہا جائے گا۔''

اس ڈرامے کے مطالعہ سے مصنفہ کی محنت اور تحقیقی کاوش کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔شاعر مشرق کی شاعری، فکر، فن، فلسفہ پر یوں تو بے شمار لکھا گیا ہیں اور ہر روز ایک نئے نکات پر خامہ فرسائی بھی کی جاتی ہے لیکن ان کی ازدواجی زندگی، ان کی ذاتی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے درد وکرب پر ڈراما لکھنا واقعی قابل تعریف ہے۔بقول پیغام آفاقی:

''اس ڈرامے میں علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کو مرکز بنایا گیا ہے جس پر عموماً کم ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ڈرامے کے مطالعے سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ صالحہ صدیقی ڈرامے کے فنی لوازمات، حسن اور اس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتی ہے۔علامہ اقبال کی زندگی کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت واقعی قابل تعریف ہے۔میں صالحہ صدیقی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید بھی کہ یہ ڈرامہ ازجلد اسٹیج پر بھی پیش کیا جائے گا۔''

اقبالیات پر یوں تو بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی گئیں مگر صالحہ صدیقی کی یہ کتاب اقبالیات اور موضوع دونوں لحاظ سے منفرد ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ صالحہ صدیقی کی اس کتاب سے جہاں اقبالیات پر معلومات میں اضافہ ہوگا وہیں ایسی کتاب گھر کی لائبریری کی بھی زینت بنی چاہیئے۔کتاب ہر لحاظ سے اچھی اور معلوماتی ہے۔

•••

تبصرہ

نام کتاب : بُرہان پور کے اہم کتبات
مرتب : اسرار اللہ انصاری
قیمت : ۷۰روپے
مبصر : ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی

ہندستان کی تاریخ میں سرزمینِ برہان پور جغرافیائی، علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی معاملات میں امتیازی خصوصیات کی بدولت عالموں، فن کاروں، مؤرخوں، حکمرانوں اور بادشاہوں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق برہان پور کے ناقابلِ فراموش حوالوں سے روشن و تابندہ ہیں۔

کسی بھی عہد میں جس طرح معاصر مؤرخین کے دستاویزات کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح تاریخی عمارتوں وغیرہ میں کندہ کتبات کی اہمیت وافادیت بھی تاریخ کے اہم اور معتبر حوالے کے طور پر مسلم ہے۔ برہان پور میں اسی طرح کتبات کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری نے ''برہان پور کے اہم کتبات'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے، جس میں موصوف اور دیگر قلم کاروں نے کتبات کی اہمیت، اس کی قرأت اور تفہیم کے مسائل اور کتبہ شناسی کے ضمن میں پیش آنے والی مشکلات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ساتھ ہی مرتب کے ذریعے زیرِ تبصرہ کتاب میں موجود مواد کی اہمیت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب میں مرحوم عبدالصبور، مرحوم عبدالستار فاروقی اور مرحوم مولوی معین الدین ندوی جیسے اہم مؤرخین اور محققین کے ذریعے لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ مضامین دراصل برہان پور کی شاہی جامع مسجد اور قلعۂ اسیر (اسیر گڑھ، برہان پور) کے کتبات کی تفہیم اور تاریخ کے اہم واقعات، فاروقی حکمرانوں اور مغل بادشاہوں کی کارگزاریوں سے متعلق ہیں۔ کتبات شناسی اور تعمیرِ مسجد کے ضمن میں لکھے گئے یہ مضامین مشہورِ زمانہ رسالہ 'معارف' میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۷۵ء کے درمیان مختلف اوقات میں شائع ہو چکے تھے۔ چونکہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ تاریخی کتبے اور ان کی تفہیم کے مرحلے گرد وغبار میں اٹ گئے تھے، تاہم اسرار اللہ انصاری نے ان کی ازسرِ نو ترتیب واشاعت کر کے ایک اہم اور تاریخ ساز کام کیا ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔

مرتب کے ذریعے اس اہم کام کو دوبارہ شائع کرنے کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف تاریخ میں فاروقی حکمرانوں کی سیکولر ذہنیت اور مذہب وملت کی تفریق سے ماورا ہو کر اپنی تعمیر کردہ مسجد میں عربی زبان وفارسی کے ساتھ ہی سنسکرت زبان کے کتبات کو بھی محراب کی زینت بنایا تھا، اس سے اہلِ علم کو متعارف کرایا جائے، اور دوسری طرف اسے برہان پور دارالسرور میں فاروقی اور مغل حکمرانوں کی دلچسپی، رواداری اور تاریخی حقائق سے پردہ ہٹانے کی کوشش کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب میں شامل خاص طور پر مولوی معین الدین ندوی کے مضامین کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتبہ شناسی اور اس کی قرأت باقاعدہ ایک فن کا درجہ رکھتی ہے۔ ساتھ ہی کتبہ شناسی کے لیے جس علمی، لسانی مہارت اور وسیع النظری کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے ازسرِ نو وا کیا گیا ہے۔ لہٰذا تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اور تاریخی رموز واسرار اور کتبات کی لاینحل تحریروں کا مطالعہ کرنے والے حضرات اور باذوق قارئین ومؤرخین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

•••

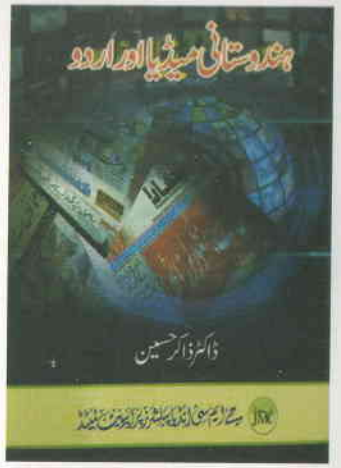

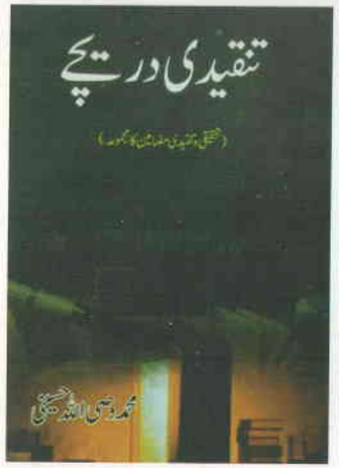

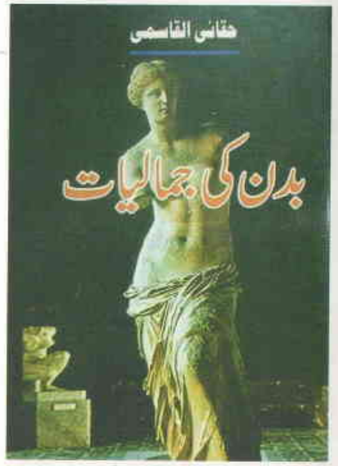

حال ہی میں شائع ہونے والی اردو زبان وادب کی کچھ اہم کتابیں